لندن کی ایک رات

pro blogspot.com

عرضِ مصنف

اس کتاب کو ناول یا افسانہ کہنا مشکل ہے۔ یورپ میں ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا ایک رُخ اگر دیکھنا ہو تو اسے پڑھیے۔

اس کا بیشتر حصہ لندن، پیرس اور ہندوستان واپس آتے ہوئے جہاز پر لکھا گیا۔ آج اسے دو سال سے زیادہ ہو گئے۔ اب میں اس مسودہ کو پڑھتا ہوں تو اسے چھاپتے ہوئے رکاوٹ ہوتی ہے۔ یورپ میں کئی برس طالب علم کی حیثیت سے رہ چکنے کے بعد، اور تعلیم ختم کرنے کے بعد، چلتے وقت پیرس میں بیٹھ کر چند مخصوص ذہنی کشمکش سے متاثر ہو کر سو ڈیڑھ سو صفحے لکھ دینا اور بات ہے اور ہندوستان میں ڈھائی سال مزدوروں کسانوں کی انقلابی تحریک میں شریک ہو کر کروڑوں انسانوں کے ساتھ سانس لینا اور ان کے دل کی دھڑکن سننا دوسری چیز ہے۔

میں اس قسم کی کتاب اب نہیں لکھ سکتا اور نہ اس کا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔

سجاد ظہیر

وزیر منزل، لکھنؤ
۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء

پہلا باب

لندن نہایت گھنے، زردی مائل، گاڑھے، تاریک کہرے سے ڈھکا ہوا ہے ایک ایسا الحاف جو نم ہو، اور ٹھنڈا جس سے ہمارا سارا جسم اور خصوصاً ناک منہ ڈھانپ دیا جائے، سانس مشکل سے لی جائے، سانس لیتے وقت یہ معلوم ہو کہ تر دھواں پی رہے ہیں، ہر چیز پر مہین مہین پانی کے قطرے جمے ہوئے ہیں، سردی زیادہ نہیں، لیکن جتنی بھی ہے تکلیف دہ ہے۔ تیسرا پہر ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رات ہو گئی۔ سڑک کی روشنی میں چمک نہیں، اندھیرے اور روشنی میں معلوم ہوتا ہے لڑائی ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی کہر کے ہلکے ہو جانے سے گیس کی روشنی چمک اٹھتی ہے۔

اس کیفیت کے باوجود لندن کی چہل پہل میں کوئی کمی نہیں۔ دکانیں روشن اور سڑکیں موٹروں، لاریوں اور بسوں سے بھری ہوئی ہیں۔ کنارے کی پٹری پر جہاں لوگ پیدل چلتے ہیں، دفتروں سے نکلے ہوئے لوگ، منشی، محرر، کاروباری، ٹائپ کرنے والی لڑکیاں، طالب علم اور چھوٹے کارخانوں میں کام کرنے والے مرد اور عورتیں تیز تیز قدم بڑھائے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ چھ بج چکے ہیں اور "بلوسبری" میں جہاں لندن کے طالب علم "اہل دماغ" اصلی اور نقلی ہر قوم کے لوگ جو انگلستان کی سیر کو آئے ہیں، اگر ٹھہرتے ہیں، جہاں انگلستان کے ذہنی انقلابی، آرٹسٹ، غریب، مصنف، وہ سب لوگ جو ایک روحانی خلا میں معلق ہیں مل جل

کر عجیب و غریب کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

چھ بج کے دس منٹ ہو گئے۔ رسل اسکوائر کے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کی گھڑی پر بار بار اعظم کی نظر جاتی ہے۔

"کمبخت آج پھر وعدہ کر کے معلوم ہوتا ہے نہیں آئے گی۔ یہ پہلی بار نہیں ہے۔ مجھے اپنی حالت پر خود شرم آتی ہے اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ ذرہ برابر بھی میرا خیال نہیں کرتی مگر میں ہوں کہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ آخر لندن میں اور بہت سی لڑکیاں ہیں اور میں کچھ ایسا بدصورت بھی نہیں۔ مگر میں اس قدر کمزور ہوں۔ مجھے اپنے اوپر ذرا بھی قابو نہیں کتنی دفعہ ارادہ کر چکا ہوں کہ اس سے ملنا چھوڑ دوں، اس سے بات تک نہ کروں شرک پڑے تو دوسری طرف منہ پھیر لوں اور اگر وہ خود میرے پاس اپنی مرضی سے آئے تو صاف کہہ دوں چلی جا میرے پاس سے، اگر مجھ سے تجھے محبت نہیں تو کیوں میرے پاس آتی ہے۔ کوئی اور عاشق ڈھونڈ، تیرے اور بہت سے طلبگار ہیں۔ میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں" اور اسی طرح کے اور بہت سے تیز و تند کلمے جس سے دراصل اسکے دل پر چوٹ لگے، اسے تکلیف پہنچے، اُسے اذیت ہو۔ اس طرح سے میں اس سے بدلہ لوں۔ مجھے جو پریشانی، کوفت، الجھن، بے اطمینانی، حسد، رشک، غصہ، رنج اسکی وجہ سے ہوتا ہے اس کا بدلہ لوں۔ لیکن کبھی مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ پہلی بار اس نے سنیچر کی شام کو ملنے کا وعدہ کیا۔ کہا کہ ساڑھے سات بجے آئے گی۔ چھ بجے تک اسے دفتر میں کام کرنا ہوتا ہے اس کے بعد گھر جائے گی اور پھر سات ساڑھے سات بجے تک میرے یہاں پہنچے گی۔ ساڑھے سات سے آٹھ بجے، آٹھ سے نو اور نو سے دس، میں کھانا کھانے بھی نہیں جا سکا، انتظار، انتظار، دس بجے کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ، غصہ کے مارے میں نے جواب تک نہیں دیا کہ "ہاں چلی آ" دروازہ کھولا کون؟ وہ نہیں بلکہ خادمہ "مسٹر اعظم آپ سے کوئی ٹیلیفون پر بات کرنا چاہتا

ہے"۔ معلوم ہوتا تھا کہ میرے جسم کا سارا خون ایک لمحے کے لئے دوڑ کر میرے سر میں پہنچ گیا۔ گرم گرم خون، میں نے جواب دیا "تھینک یو میری"۔ اور یہ کہہ کر ٹیلیفون سننے گیا۔

"کون ہے"؟ میں نے کہا، اگرچہ مجھے معلوم تھا۔

"میں ہوں ڈارلنگ، میرے پیارے تم بہت بہت خفا ہو؛ تمہاری آواز سے معلوم ہوتا ہے مجھے معاف کر دو۔ مگر قصور میرا نہیں۔ کچھ لوگ میرے یہاں ملنے کے لئے آ گئے۔ میری والدہ نے کہا کہ میں انکی مہمانداری کروں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کچھ بہانہ کروں مگر کچھ بنائے نہ بنی اور اب بہت دیر ہو گئی۔ پیارے اعظم معاف کر دو"۔

میرے غصہ کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ میں ایک ہفتہ سے اس سے ملا نہیں تھا۔ ہر روز کچھ نہ کچھ کام اسے لگا رہتا تھا اور آج آخر کار وہ مجھ سے ملنے آنے کو تھی اور اس طرح سے اس نے میری آرزوؤں، تمناؤں پر پانی پھیر دیا۔ میرا جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ "جہنم میں جاؤ!" کہہ کر ٹیلیفون رسیور کو اس کے خانے میں رکھ دوں اور اس گفتگو کا خاتمہ کر دوں۔ یہ گفتگو جو "تاروں" پر ہو رہی تھی۔ یہ گفتگو جس میں انسانی آواز، انسانی پیکر سے جدا ہو کر محض آواز بن کر، خالص آواز ہو کر ہمارے کانوں سے ٹکراتی ہے اور تھوڑی بہت الہام کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ الہام تو آسمانی "حقیقت" ہے لیکن ٹیلیفون کی آواز سن کر سچ اور جھوٹ کی تمیز کرنا بہت دشوار ہے۔ جھوٹ بولنے کا بہترین طریقہ یقیناً وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ جہاں آ گئے! وہ کچھ بہانہ تو کر سکتی تھی۔ اور اسکی ماں اسے باہر جانے کی اجازت دے دیتی وہ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہے۔ بہانہ کر رہی ہے دراصل وہ کسی اور کے ساتھ گئی ہوگی۔ عین وقت پر کوئی اور پسند آ گیا ہوگا۔ اس کے ساتھ سیر و تفریح سینما تھیٹر۔ یا موٹر پر گھومنے۔ میرے پاس تو موٹر بھی نہیں اور میں کوئی امیر کبیر نہیں۔ اصلی وجہ نہ آنے کی یہ ہے اور اب بہانہ کر رہی ہے "ڈارلنگ اعظم، پیارے اعظم" جھوٹی دغاباز۔ یہ سب کچھ تھا

profakhar.blogspot.com

لیکن میں نے جواب دیا۔

"دراصل! اور میں تمہارا انتظار کرتے کرتے ادھ مرا ہو گیا۔ تم نے کم از کم ٹیلیفون تو اور پہلے کر دیا ہوتا۔ لیکن ابھی تک دیر نہیں ہوئی ہے۔ انڈر گراؤنڈ" اور "بس" تو ساڑھے بارہ بجے تک چلتی رہتی ہیں۔ میرے ساتھ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تم گزار سکتی ہو....."

میری آواز میں بجائے غصہ کے گڑگڑاہٹ آ گئی۔ مجھے اس کا احساس ہو رہا تھا میں محسوس کر رہا تھا کہ میں اپنے کو ذلیل کر رہا ہوں، لیکن ایک ایسی طاقت جس کے سامنے میں بالکل لاچار و مجبور تھا، معلوم ہوتا تھا مجھے پستی کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔ میں نے اپنی خودداری کو اپنی نظروں میں قائم رکھنے کے لئے سوچنا شروع کر دیا کہ عشق میں ذلت اٹھانا دراصل ذلت نہیں اور دنیا کے ان تمام شاعروں کے شکوے اور گلے مجھے یاد آنے لگے جو کوچہ جاناں کے کتے بن کر اغیار کی ٹھوکریں کھاتے ہیں، دربان کی گالیاں سنتے ہیں اور معشوق کے ہرجائی پن اور ناز اور نخرے کو لذتِ روح سمجھ کر نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ خود اس کی فرمائش کرتے ہیں کہ ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں۔

لیکن ہماری شاعری اور چیز ہے اور ذلت کی حقیقت کچھ اور، میں اپنے دل کو لاکھ سمجھاؤں لیکن حقارت کی شرمناک صورت بار بار میری نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔

اس نے جواب دیا "نہیں ڈارلنگ اعظم۔ اب بہت دیر ہو گئی۔ صبح سات بجے مجھے اٹھنا ہے۔ تم تو جانتے ہو....."

"مگر کل تو اتوار ہے تمہیں دفتر تو جانا نہیں"

"ہاں یہ تو ہے مگر پھر بھی تم جانتے ہو، اتوار کے دن گھر میں خادمہ دیر کو آتی ہے اور مجھے گھر کے کام کاج میں والدہ کی مدد کرنا ہوتی ہے۔ دراصل میں سچ بول رہی ہوں..... تم

معلوم ہوتا ہے میری باتوں کا یقین نہیں کر رہے ہو..... یہ بہانہ نہیں۔ تم جانتے ہو میں تم کو کس قدر چاہتی ہوں۔ اچھا کل میں بارہ بجے کے قریب تم کو ٹیلیفون کروں گی اور پھر اس وقت کسی دوسرے دن تم سے ملاقات کا وقت طے کروں گی، اب مجھے اس وقت معاف کرو"

مجھ سے ٹیلیفون پر بات کرنے تک کی اسے اس وقت فرصت نہیں اور کل صبح سویرے اٹھنا ہے اپنی والدہ کی مدد کرنے کے لئے۔ جھوٹ جھوٹ۔ وہ ضرور کسی اور کے ساتھ سیر و تفریح کو جا رہی ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ بس اس سے اچھا موقع اب مجھے نہیں ملے گا۔ اس سے صاف صاف کہہ دوں جو کچھ بھی میرا شبہ ہے۔ مگر میں نے جواب دیا۔

"اچھی بات ہے جین، کل بارہ بجے تمہارے ٹیلیفون کا میں انتظار کروں گا۔ گڈ نائٹ"

اور دوسرے دن ٹیلیفون ندارد۔ سارا دن میرا بیکار ضائع ہوا۔ اور اگر وہ ایک بجے کے قریب فون نہ آ جاتا تو میں پاگل ہو جاتا۔ راؤ خوش قسمت آدمی ہے اسے کبھی عشق عاشقی کے جنجال میں پڑتے کسی نے نہ دیکھا۔ باوجود اس کے ہمیشہ کوئی نہ کوئی باکی لڑکی اس کے قبضے میں رہتی ہے۔

کب تک یہاں میں انتظار کروں۔ سوا چھ بج گئے۔ سردی ہے اور جین کا ابھی تک پتہ ہی نہیں۔

لیکن جین کا ہنستا ہوا چہرہ، اس کا لمبا چھریرہ بدن۔ اس کی چمکدار آنکھیں جو ہر وقت گھبرائی ہوئی ادھر ادھر دیکھتی ہیں۔ اس کی ہنسی کی آواز، اس کا گھبرا کر جھوٹ بولنا یہ سب اعظم کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندتا اور اس کے دماغ کو تھوڑی دیر کے لئے بے حس کر دیتا تھا۔ دوسرے تیسرے منٹ انڈر گراؤنڈ کی لفٹ کا دروازہ کھلتا اور لوگ اس میں سے باہر نکلتے، کبھی بیس کبھی تیس کبھی اس سے زیادہ کبھی اس سے کم اور اعظم کی نظر اس سارے

profakbar.blogspot.com

گردہ پر پڑتی۔ اور جب آخری شخص نکل جاتا اور جین کی صورت اُسے نظر نہ آتی تو پھر اُس کی پریشانی بڑھتی، کبھی گھڑی پر نظر کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ اخبار کی دوکان کے سامنے بڑے بڑے اشتہار لگے ہوئے تھے۔ ٹائمز، ڈیلی میل، مارننگ پوسٹ، ڈیلی ٹیلیگراف وغیرہ اس کی نظر شام کے اخباروں پر پڑی۔ جنہیں لوگ اسٹیشن کے باہر بیچ رہے تھے۔

"فٹ بال کے میچ کے نتیجے"۔ "میچ کے آخری نتیجے"۔ اخبار بیچنے والے پکار رہے تھے۔

ٹہلتے میں اسکی نظر چند اور اشتہاروں پر پڑی جو تختوں پر چسپکے ہوئے تھے۔ "بیکار مزدوروں کا ہائڈ پارک میں جلسہ" "دس انگریزی سپاہیوں نے دس ہزار ہندوستانی نیٹوز کو فساد کرنے سے روکا"۔ "ایک گورا زخمی ہوا اور ۱۵ نیٹوز کی جان گئی"۔ بڑے بڑے، کوئی ڈھائی فٹ لمبے اور ایک فٹ چوڑے کاغذوں پر یہ اشتہار سرخ حرفوں میں لکھے ہوئے تھے۔ اعظم کا خیال ایک لمحہ کے لئے اپنے دوست کے انتظار سے ہٹ کر ہندوستان، وطن کی طرف گیا۔ "یہ کمبخت انگریزی اخبار کتنی حقارت کے ساتھ ہم ہندوستانیوں کا ذکر کرتے ہیں"۔ "نیٹوز" "ہم نیٹوز" ہیں۔ اور یہ لال منہ بندر، جو اس ملک میں رہتے ہیں، یہ کون ہیں؟"

اور وہ بے چارے غریب جنہوں نے گوروں کی گالیاں کھائیں اور ہائڈ پارک کے بیکار انگریز مزدور جو بھوکے مرتے ہیں؟ اعظم کا خیال اس طرف نہیں گیا۔

عربی کی ایک مثل ہے کہ "انتظار موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے" موت جب بہت قریب ہوتی ہے تو مرنے والے کے ہوش و حواس مختل ہو جاتے ہیں۔ انتظار کی شدت ذہن کو کام کرنے سے روک دیتی ہے۔ خصوصاً ایسا انتظار جیسا اعظم کو تھا۔ اب تو وہ جین کے آنے کو بھی بھول سا گیا۔ جین کا آنا، اس کی اور اعظم کی ملاقات، خوشی، یا اس کا نہ آنا اور کلفت ان تمام خیالات اور احساسات نے مادی حقیقت کے جامے کو چھوڑ کر، دھندلی سی غیر معنوی صورت اختیار کر لی اور اس

کے ذہن پر ایک کالی گھٹا سی چھا گئی۔

"ہلو اعظم! تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو!" انڈر گراؤنڈ اسٹیشن سے راؤ نکلا اور اُس نے اعظم کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

راؤ کے اس طرح سے یکبارگی آجانے سے اعظم کے دل کو فوراً سکون ہو گیا۔ جس طرح رنج اور اذیت کے وقت رونے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس وقت اعظم کا خیال جو صرف ایک نقطہ پر جم کر اس کے دل میں ناسور کی طرح سے چبھنے لگا تھا، اب دوسری طرف ہٹ گیا، راؤ اس کا دوست تھا۔ لیکن اعظم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ راؤ کو کیا جواب دے۔ یہ کوئی بڑے فخر کی بات تو تھی نہیں کہ جین کے انتظار میں کھڑے ہوئے رسل اسکوائر کے اسٹیشن پر میاں اعظم سردی کھا رہے ہیں اور ان کی جان جہاں کا پتہ ندارد۔ لیکن اعظم نے اپنے دل میں سوچا۔ راؤ سے چھپانے سے آخر کیا فائدہ؟ وہ ضرور بھانپ جائیگا" اور اس نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "جین سے اپائنٹ منٹ تھا چھ بجے اس نے یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ ابھی تک وہ آئی نہیں۔ چھ بجے کے بیس منٹ ہو گئے۔ نعیم کے یہاں آج پارٹی ہے اس نے دونوں کو بلایا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں"۔

راؤ کا خیال اعظم کی اندرونی حالت کی طرف نہیں گیا۔ بھلا یہ بھی کوئی پریشانی کی بات ہے کہ وعدے کے بموجب کوئی ملاقات کے لئے نہیں آئے، خصوصاً ایک لڑکی سنگار کرنے میں بے چاری کو دیر ہو گئی ہو، اسے اپنے لبوں کی لالی کی گہرائی شاید پسند نہ آئی ہو اور وہ اسے دوبارہ ٹھیک کرتی ہو۔ غرض دیر ہو جانے کے سینکڑوں اسباب ہو سکتے ہیں۔ غصہ اور بے چینی کا تو کوئی موقع نہ تھا۔

لیکن راؤ جین کا عاشق تو تھا نہیں۔ اعظم کو تو اس سے عشق تھا۔

profakhar.blogspot.com

راؤ نے کہا "کیا تم بھی نعیم کے ہاں مدعو ہو؟ مجھے بھی اس نے بلایا ہے۔ چلو پھر ساتھ چلیں۔ جبین کو نعیم کا پتہ تو معلوم ہی ہے۔ وہ وہاں سیدھی چلی آئے گی۔ یہاں سردی میں ٹھٹھرنے سے کیا فائدہ۔ آؤ چلو۔"

عظیم ایک لمحے کے لئے ہچکچایا۔ "رکے یار رکے، شاید وہ پانچ منٹ کے اندر آ جائے اگر اب چلا جاؤں تو اتنی دیر تک رکنا بیکار رہا۔ اور شاید وہ نہ آئے کیا معلوم" راؤ سمجھ گیا کہ اعظم کس کشمکش میں مبتلا ہے اس نے اپنے مزاحی لہجے میں تیزی سے پھر کہا: "چلو بھی اعظم۔ یہاں کھڑے رہنے سے کیا فائدہ۔ مجھے یہ تو پتہ نہیں کہ جبین نے اگر تم کو یہاں نہ پایا تو وہ واپس چلی جائے گی۔ اگر اسے آنا ہے تو وہ سیدھی نعیم کے ہاں آ سکتی ہے۔"

اعظم نے طے کیا کہ راؤ کے ساتھ چلا جانا بہتر ہے۔ اسے پھر اس خیال نے گھیر لیا کہ وہ اس عورت کے پیچھے اپنی خودداری تک کھو بیٹھا۔ ذلت کے بھاری بوجھ سے اس کا دل پھر بیٹھنے لگا۔ اس کے قدم اٹھے لیکن آہستہ آہستہ، اور وہ راؤ کے ساتھ اسٹیشن سے باہر نکلا۔

راؤ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جس پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی، جیسے کوئی مجروح جانور۔ اذیت اور بے بسی، وحشت اور لاچاری۔ راؤ نے یکبارگی محسوس کیا کہ اس کے دوست کی کیا حالت ہے۔ اسے یہ خیال کر کے شرمندگی سی ہوئی کہ اس نے اعظم کی اصلی کیفیت کا ابھی تک اندازہ نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں اعظم کے لئے ہمدردی کے جذبات ابھر آئے پھر کچھ ترس آیا، کچھ ہنسی آئی۔ اس لڑکی نے اچھے خاصے بھلے چنگے انسان کو پاگل کر دیا۔ آدھے گھنٹے سے کھڑا یہاں غریب انتظار کر رہا ہے۔ اور وہ ہے کہ آنے کا نام تک نہیں لیتی۔ یہ آج پہلی دفعہ نہیں۔ اب تو اعظم کی پڑھائی پر بھی اس کا اثر پڑنے لگا ہے۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو امتحان میں پاس ہونا مشکل ہو جائیگا۔ کسی طرح سے اس سے اعظم کا پیچھا

چھوٹے تو اچھا ہے۔

راؤ نے کہا: "ارے بھائی اعظم بس اتنے غمگین مت ہو۔ جبین ضرور تھوڑی دیر میں آ جائیگی۔ کسی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ آج کہرا کس قدر ہے اور سردی بھی۔ گھر سے نکلتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ چلو "پب" میں چلتے ہو۔ ایک ایک گلاس "بیئر" پئیں۔ پھر نعیم کے یہاں چلیں گے۔

اعظم کی قوت ارادی اب بالکل غائب ہو گئی تھی۔ "ہاں ضرور" اس نے آہستہ سے کہا۔ "سردی میں ایک ایک پیگ وسکی یا برانڈی کیوں نہ پی جائے۔" راؤ اور اعظم دونوں آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ کہرا چند منٹ کے لئے کم ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے بجلی کی روشنی چمک اٹھی تھی۔ راؤ کا سیاہ چہرہ بڑی بڑی بیضوی آنکھیں۔ جیسے پرانے راجپوت شہزادوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ اس کا درمیانہ قد اور نازک سا جسم بعض ہندو دیوتاؤں کی طرح کالے ریشم کی طرح ملائم بال جو اس کی پیشانی پر گرے ہوئے تھے اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ لیکن کچھ کیریکٹر کی کمزوری بھی معلوم ہوتی تھی۔ بجلی کی روشنی کے سامنے جب اس کا چہرہ آتا تو اس سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ اعظم کی حالت پر افسوس کر رہا ہے۔

اعظم کی نظر راؤ کے چہرہ پر پڑی۔ اسے فوراً اس بات کا احساس ہوا کہ راؤ کس سے اظہار ہمدردی کر رہا ہے۔ لفظوں میں نہیں بلکہ اپنے رویئے سے اور اپنی خاموشی سے اعظم کو تھوڑا بہت سکون ہو گیا۔ دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں علاوہ عشق کے۔

"تم نے آج شام کا اخبار دیکھا، ہندوستان میں پھر کہیں گولی چلی۔" اعظم نے کہا "نہیں میں نے اخبار تو نہیں دیکھا مگر اشتہار دیکھے ہیں۔ اب تو یہ روز کا دستور ہو جاتا ہے ہم کالے آدمیوں کی جان کیڑوں مکوڑوں کے برابر ہے اور قصور ضرور ہمارا ہی ہوگا! ہم

protakbar.blogspot.com

ہندوستانی اسی لائق ہیں، کمینے، ذلیل، بزدل، جوتا کھاتے ہیں مگر انگریزوں کی خوشامد سے باز نہیں آتے۔ ہندو مسلمان کی جان کے درپے، مسلمان ہندو کا گلا گھونٹنے کے لئے تیار۔ کوئی نہیں میرا بس چلے تو ساری قوم کو توپ کے سامنے رکھ کر اڑا دوں۔ اس قوم کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ خیال تو کرو ۳۰ کروڑ انسان اور ایک لاکھ سے بھی کم انگریز ان پر مزے سے حکومت کرتے ہیں۔ اور حکومت بھی کیسی حکومت! ہندوستان میں ذلیل سے ذلیل انگریز کا رتبہ بڑے سے بڑے ہندوستانی سے بڑھ کر ہے۔ یہاں انگلستان میں چاہے انگریز مرد ہمارے جوتے صاف کرتے اور انگریز لڑکیاں ہم سے محبت کریں، مگر سویز کے اس پار تو ہم سب "کالا لوگ"، "نیٹوز"، "غلاموں سے بدتر" سمجھے جاتے ہیں۔ میں بیرسٹر ہو جاؤں اور تم انجینئر مگر ہندوستان میں وہی "نیٹو" کے "نیٹو" ہو گے اور انگریزوں کی ٹھوکریں کھاؤ گے اور باوجود اس کے پھر الٹا انہیں کو "سرکار"، "سلام"، "خداوند" اور "مائی باپ" کہو گے۔ اتنی ذلت برداشت کرنے پر بھی جس قوم کے کان پر جوں تک نہ رینگے اس کا تو صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جانا ہی بہتر ہے مجھے تو خوشی ہوتی ہے جب ہندوستان سے گولی چلنے کی خبر آتی ہے۔" راؤ نے تلخی کے ساتھ کہا۔

اعظم راؤ کی اس مبالغہ آمیز گفتگو پر ہنس پڑا۔ اسے پالیٹکس سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ مگر راؤ کی ان باتوں میں اس قدر حرارت تھی کہ اعظم تک اس کا اثر پہنچ ہی گیا۔

"بھئی راؤ اتنا بھی کیا مبالغہ! اس طرح باتیں کرنا تو سہل ہے مگر جو لوگ وطن کی ترقی کی کوشش کر رہے ہیں ان کی مدد کرنے کے لئے کوئی نہیں تیار ہوتا۔ اگر ایسا ہی تم چاہتے ہو کہ ہندوستانی ذلت سے نجات پائیں تو پھر تم جا کر ان لوگوں کی مدد کیوں نہیں کرتے جو وطن کی بھلائی کے لئے کوشاں ہیں؟"

"وطن کی بھلائی کے لئے کوشاں ہیں؟ ذرا مجھے بتایئے تو سہی۔" راؤ نے تیزی سے پوچھا

"کسی کو آج تک معلوم نہیں کہ وطن کی بھلائی ہے کس چڑیا کا نام؟ اس کے لئے کوشاں ہونا تو درکنار۔ زنانہ بن کر چرخا کاتنے میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا مہاتما گاندھی کی طرح سچ کی کھوج کرنے میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا کونسل کی ممبری اور منسٹری میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا سوشل ریفارم اور اچھوت کانفرنس میں حصہ لینے میں وطن کی بھلائی ہے؟ سرکاری ملازمت میں وطن کی بھلائی ہے یا ہندو مہا سبھا اور مسلم لیگ میں؟ وطن کی بھلائی کے لئے ہر شخص کے پاس وطن کی بھلائی کا ایک نسخہ ہے۔ ہر شخص، معلوم ہوتا ہے کہ وطن کی بھلائی کے لئے کوشاں ہے۔ ہر شخص پکار پکار کر کہتا ہے کہ وطن کی بھلائی کے لئے کام کر رہا ہے۔ حد ہو گئی، ان کی دیکھا دیکھی انگریزی گورنمنٹ تک کہنے لگی کہ وہ بھی ہندوستان کی بھلائی چاہتی ہے! اور ملک کی حالت کیا ہے؟ ایک طرف تو غربت اور بھوک کا سایہ ملک پر پھیلتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف ظلم و جبر کا جال چاروں طرف سے ہم کو جکڑتا جا رہا ہے۔ کیا اچھے ہماری بھلائی کرنے والے ہیں! میں باز آیا ایسی بھلائی کرنے سے کم از کم میں کسی کو دھوکا تو نہیں دیتا۔ میں صاف صاف کہتا ہوں کہ میں صرف اپنی بھلائی چاہتا ہوں۔ رہ گیا وطن اور اس کی خدمت، میاں اعظم ہندوستان کی حالت حد سے گزر چکی ہے جتنی جلدی یہ قوم جس کا نام ہندوستانی ہے فنا ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔" "راؤ تم کو تو خودکشی کر لینا چاہیے۔ میں نے تم سے بڑھ کر کوئی یاس مشرب انسان نہیں دیکھا۔ لیکن دیکھنے میں تم اتنے خوش نظر آتے ہو۔ عجیب بات ہے۔" اعظم نے کہا اور اس کا خیال پھر چمن کی طرف گیا اور اپنی مایوسی کا احساس اسے ہوا۔ وہ یکبارگی چپ ہو گیا اور چہرے سے پھر غمگینی ظاہر ہونے لگی۔ راؤ نے فوراً اعظم کی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور ہنس کر جواب دیا: "خوشی سے زندگی بسر کرنے کا راز ناامیدی میں ہے۔ ناامیدی کا بلند ترین درجہ کامل بے حسی کی کیفیت ہے۔ یہ وہ درجہ ہے کہ انسان کو خوشی اور غم، آرام اور

protakbar.blogspot.com

تکلیف میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ہم ہندواسی کو نروان کہتے ہیں۔"

اعظم پر دوبارہ غمگینی پوری طرح سے چھا گئی۔ اس نے راؤ کی باتوں پر ہنسنے کی کوشش کی مگر اس کی ہنسی بے معنی سی مسکراہٹ بن کر اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ جین آخر کیوں نہیں آئی۔ کیا دراصل وہ مجھ سے بالکل محبت نہیں کرتی؟ لیکن اُس نے سوچا کہ اگر ایسا ہوتا تو جین اس سے ملنے کا وعدہ کیوں کرتی۔ اس سے اظہار عشق کیوں کرتی۔ کیا اس کے پیار اور محبت کے الفاظ سب جھوٹے تھے؟ شک اور رشک کا دیو پھر اعظم کے ذہن پر قابو پانے لگا۔ کیا معلوم! اس نے سوچا، شاید اس کے کئی عاشق ہوں۔ یہاں آج کل، کوئی بری بات تو سمجھی نہیں جاتی۔ مجھ سے بھی ہفتہ میں ایک دفعہ اگر وہ مل لیتی ہے اور پھر میرے علاوہ شاید کوئی اور بھی ہو۔ یا شاید چونکہ وہ سمجھتی ہے کہ اگر مجھ سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ مجھ سے عشق نہیں کرتی تو مجھے بہت تکلیف ہوگی، اس خیال سے وہ مجھ سے جھوٹ موٹ وہی پہلے کے سے تعلقات قائم رکھنا چاہتی ہے اور رفتہ رفتہ مجھ سے ملنا چھوڑ دے گی۔ اس طرح سے دیر کرنا اور وعدہ کرکے ملنے نہ آنا اسی کا پیش خیمہ ہے۔

کہرا پھر گھرآیا اور چاروں طرف اندھیرا بڑھ گیا۔ راؤ نے اپنے کوٹ کے کالر کو اُٹھا کندھے جھکائے اور جیب میں دونوں ہاتھ پوری طرح ڈال کر تیزی سے چلنا شروع کیا۔

"اَو ذرا اور تیز چلیں مجھے سردی معلوم ہو رہی ہے۔" راؤ نے کہا۔

اعظم نے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر اس نے قدم تیز بڑھانے شروع کئے۔ چند منٹ میں وہ پب تک پہنچ گئے اور دونوں اندر داخل ہوئے۔

دُوسرا باب

انگلستان میں شراب خانے عام طور سے دو یا تین حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ سامنے کا حصہ جس میں مزدور طبقہ کے لوگ جاتے ہیں اور اندر کا حصہ جس میں پیسے والے لوگ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک چھوٹا سا تیسرا حصہ بھی ہوتا ہے جہاں وہ لوگ جنہیں جلدی سے واپس چلا جانا ہوتا ہے شراب پی لیتے ہیں۔ اس حصے میں بیٹھنے کے لئے کرسیاں وغیرہ ہوتی ہیں۔ شراب بیچنے والا درمیان میں ہوتا ہے۔ اس کے چاروں طرف کوئی ڈیڑھ گز اونچی اور تقریباً ایک فٹ چوڑی لکڑی کی میز کی قسم کی چیز ہوتی ہے۔ اس میز میں اندر کی طرف نل لگے ہوتے ہیں۔ جن میں سے گلاس بھر بھر کر بیئر ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو بوتل میں بھری ہوئی شراب نہیں پینا چاہتے۔ یہ ایک معمولی شراب خانہ تھا۔ غریبوں کے حصے میں تین چار بنچیں پڑی ہوئی تھیں اور ان کے سامنے لکڑی کی میزیں تھیں۔ کچھ مزدور اپنے سامنے ایک ایک گلاس بیئر لئے ہوئے بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور تین چار بنچ والی میز کے کنارے کھڑے ہوئے تھے۔ کسی کے سامنے شراب بیچنے والے نے ابھی ابھی گلاس بھر کر رکھا تھا۔ جس سے جھاگ اُٹھ رہا تھا۔ کسی کا گلاس آدھا تھا اور وہ خاموشی کے ساتھ اپنا پائپ پی رہا تھا۔ کسی کا گلاس بالکل خالی تھا۔ اور وہ ایک اور مانگ رہا تھا۔ تمباکو کا دھواں سارے کمرے میں بھرا ہوا تھا۔

pdfakbar.blogspot.com

راؤ اور اعظم اسی کمرے میں داخل ہوئے اور "بار" کے کنارے سے آ کر کھڑے ہو گئے۔

"گڈ ایوننگ سر" شراب بیچنے والے نے راؤ کو دیکھ کر کہا۔ راؤ چونکہ اکثر اس شراب خانے میں جایا کرتا تھا۔ اس وجہ سے مالک دوکان اسے پہچاننے لگا تھا۔

"کتنا خراب موسم ہے" مالک نے سلام کرنے کے بعد فوراً کہا۔ انگلستان میں موسم پر اظہار رائے کرنا ہر شخص اپنا فرض سمجھتا ہے۔ بجائے مزاج پرسی کے موسم کی اچھائی یا برائی کا ذکر کرنا، ایک دستور سا ہو گیا ہے، جس کے جواب میں دوسرا شخص اتفاق رائے کا اظہار کرتا ہے اور اگر اسے کچھ اور ضروری بات نہیں ہوا کرتی، اور اس کا دل چپ رہنے کو بھی نہیں چاہتا تو پھر موسم پر گفتگو چھڑ جاتی ہے ہر شخص اپنے اپنے تجربات بیان کرتا ہے، سال گزشتہ موسم اتنا برا نہیں تھا۔ پانچ سال ہوئے جب گرمیوں کے مہینے میں سورج بالکل نہیں دکھائی دیا اور مسلسل بارش ہوتی رہی اور جاڑوں بھر دھوپ ہی دھوپ رہی، تین برس پہلے اتنی سردی پڑی کہ نل میں پانی جم گیا۔ دریائے ٹیمس پر اسکیٹنگ ہوتی تھی وغیرہ وغیرہ غرض اس گفتگو کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ انگریز قوم نے غالباً انفرادی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے اس رسم کو رائج کیا ہے۔ موسم کی باتیں کر کے ہر شخص اپنے ذاتی معاملات پر اور دل کو گفتگو کرنے سے روک دیتا ہے۔ یہ ایسا مضمون ہے جس پر ہر شخص آزادی کے ساتھ اظہار رائے کر سکتا ہے۔ بغیر یہ بتائے ہوئے کہ اس کا "اسم شریف" کیا ہے۔ اس کا "دولت خانہ" کہاں ہے۔ اس کا پیشہ کیا ہے، اس کی تنخواہ کیا ہے۔ اس کا مذہب کیا ہے، اس کی ذات کون سی ہے، جو ہمارے وطن کا دستور ہے۔

"گڈ ایوننگ" راؤ نے جواب دیا۔ "ہاں کس قدر برا موسم ہے۔ معلوم نہیں یہ کہرا کب اٹھے گا" اور پھر اس نے اعظم سے پوچھا "کیا پیو گے؟"

"برانڈی" اعظم نے جواب دیا۔ اسے اس وقت تیز شراب کی خواہش تھی۔

راؤ نے اعظم کے لئے برانڈی اور اپنے لئے وہسکی کا آرڈر دیا۔ شراب بیچنے والے نے دونوں گلاس اور سوڈے کی بوتل، اعظم اور راؤ کے سامنے رکھ دیئے۔ راؤ نے سوڈا ملا کر اور اعظم نے بغیر سوڈا ملائے ہوئے گلاس ساتھ ساتھ لبوں کی طرف اٹھائے۔

"چیرز یو اعظم" راؤ نے مسکرا کر کہا اور پہلا گھونٹ پیا۔

"چیرز یو راؤ" اعظم نے آہستہ سے غمگین آواز میں جواب دیا اور راؤ کے ساتھ ہی ساتھ پہلا گھونٹ پیا۔ پھر دونوں نے گلاس میز پر رکھ دیئے۔ گفتگو کی کوشش معلوم ہوتا تھا دونوں کر رہے تھے۔ اعظم اپنی اصلی حالت کو بھلا دینے کے لئے۔ اور راؤ جس پر اعظم کی افسردگی کا اثر پڑتا جا رہا تھا، اعظم کو کسی طرح سے تسکین دینے کیلئے۔ مگر جیسا اکثر ہوتا ہے۔ کوشش کرنے سے گفتگو نہیں ہوتی۔ دونوں پر ایک تکلیف دہ، بھاری خاموشی چھا گئی۔ شراب پینے سے یہ کیفیت اور مستقل سی ہو گئی، بجائے اس کے کہ ان کی زبانیں کھلیں اور ان کے قلب میں حرارت پہنچے تھوڑی سی شراب کا اس وقت الٹا اثر ہوا۔

"جین، جین، جین" اعظم کے دماغ پر اندرہی اندر جیسے کوئی بار بار ہتھوڑا سا برسا رہا تھا۔

اور راؤ اب اعظم کی اس حالت میں خود اتنا ڈوب گیا تھا کہ اس کے دوست کی تکلیف کا اثر خود اس تک پہنچ رہا تھا۔ "یہ روحانی کرب ایسا بھی نہیں جس سے انسان کو بالآخر تقویت پہنچتی ہو" راؤ نے سوچا۔ "یہ تو بالکل بے فیض، لاحاصل اذیت ہے۔ جس کا اثر سوائے دل اور دماغ کے معطل ہو جانے کے اور کچھ بھی نہیں۔ ہر اذیت بے سود نہیں۔ بعض تکلیفیں اس قسم کی بھی ہوتی ہیں۔ جن سے ہمیں روحانی اور جسمانی فائدہ پہنچتا ہے، یا ہمیں نہیں تو ہمارے تکلیف برداشت کرنے سے کسی اور کو فائدہ ہو"

راؤ کی آنکھوں کے سامنے یکبارگی ہندوستانیوں کی ایک بھیڑ نظر آئی، جس میں زیادہ تر

profakhar.blogspot.com

غریب میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے لوگ تھے۔ جن کے چہروں پر دھوپ اور ہوا اور بھوک کے اثر سے جھریاں اور گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ جن کے ہاتھ مزدوری کرنے سے سخت اور مضبوط ہوتے تھے، جن کی آنکھوں میں محنت کی روشنی تھی۔ جن کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ جن کی ٹانگیں ان کی میلی دھوتیوں سے لکڑی کی طرح نکلی ہوئی تھیں، ان لوگوں کی بھیڑ سڑک کے چوراہے پر، اس بھیڑ میں ملے جلے ہندوستانی طالب علم، وہ غریب جن کو پچیس روپے مہینے تک کی نوکری اب نہیں ملتی، دُبلے پتلے، سینہ کمزور، چاروں سے داڑھی نہیں بنائی۔ چھوٹا انگریزی کوٹ اور دھوتی، میلی سی عینک، ننگے سر، یہ بھی سینکڑوں کی تعداد میں۔ اور اسی طبقے کے اور بہت سے لوگ، سارا مجمع ہل رہا ہے، سمندر کی سی لہریں۔ آگے بڑھنے کی کوشش مگر راستہ رُکا ہوا ہے۔ گورے بندوقیں لیے ہوئے سامنے کھڑے ہیں۔ مشین گنیں بھی ہیں۔ سنگینیں دھوپ میں چمک رہی ہیں۔ سپاہیوں کے پیچھے گھوڑے پر سوار انگریزی افسر۔ تیز دھوپ، گرمی، چہروں پر پسینے کے قطرے نمایاں ہیں۔ ہوا بند۔ راؤ اس مجمع کے بیچ میں کھڑا ہوا ہے۔ آخر ہم آگے کیوں نہیں بڑھتے؟ یہاں تک پہنچ کر رک جانے سے کیا فائدہ؟ اتنی دور تک آئے اور اب رُکے ہوئے ہیں۔ "آگے بڑھو" کی آواز یکبارگی اس کے کانوں میں آئی اور اس کے سارے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

تکلیف جس سے کچھ فائدہ پہنچے، تکلیف جو آرام کی ہراول ہو۔ یہاں تک کتنی مشکل سے ہم پہنچے اور اب آگے بڑھنے والے ہیں۔ لیکن نہیں، نہیں، نہیں۔ زندگی اتنی سہل نہیں جتنی ہم سمجھے ہوئے ہیں .... وہ ایک میدان میں کھڑا ہوا ہے سارا مجمع غائب ہو گیا، سامنے گورے کھڑے ہیں اور چاروں طرف اِدھر اُدھر خون کے دھبے۔ گرم تازہ خون اور زخمی انسان اور مُردے۔ کوئی منہ کے بل پڑا ہے اور اُس کے ہاتھ پیٹ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ کوئی چت پڑا ہے اُس کے سر پر گولی لگی ہے۔ آنکھیں دہشت زدہ۔ دیدوں سے پھٹی پڑتی ہیں، مُنہ کھلا

ہوا۔ ان کے چہرے پر، گردن پر، میلے کرتے پر، لال لال خون کے بڑے بڑے دھبے۔ ایک زخمی جس کے پاؤں پر گولی لگی ہے۔ اور جو درد کی شدت سے زور زور سے چلّا رہا ہے۔ یہ ہے تکلیف۔ اس کا نام ہے درد۔ اس شراب کے گلاس کو تو ذرا دیکھو۔ اس کی تیزی غائب اس کی ٹھنڈک ندارد۔ اس کا رنگ بدل گیا۔ سیاہی کی گاڑھی چیز گہرا سرخ رنگ۔ خون گرم۔ تازہ خون۔ یا خدا!"

"دس انگریزی سپاہیوں نے دس ہزار نیٹوز کو فساد کرنے سے روکا۔" ایک گورا زخمی ہوا اور پندرہ نیٹوز کی جان گئی۔"

راؤ کو یقیناً سردی محسوس ہوئی اور اس کا سارا جسم تھرتھرا گیا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ میں باقی بچی ہوئی شراب کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے اعظم کی طرف دیکھا وہ بھی اپنا گلاس ختم کر چکا تھا۔ اس نے راؤ سے پوچھا: "ایک ایک اور پیتے ہو؟" "معلوم نہیں" راؤ نے جواب دیا "میری طبیعت آج کچھ اچھی نہیں۔ آج دن کو میں نے کھانا نہیں کھایا اور چائے کے وقت بھی صرف ایک پیالی پر معاملہ ٹال دیا۔ اس وقت بھوک نہیں تھی۔ اب جو خالی پیٹ میں شراب پی تو سر چکرانے سا لگا۔"

"واہ واہ" اعظم نے ہنس کر کہا "بس ایک ہی گلاس کی طاقت ہے! آؤ، پیو بھی، تم اور پینے سے مر تو نہیں جاؤ گے۔ یہاں سے نکل کر کچھ کھا لینا۔ طبیعت درست ہو جائے گی۔"

"اچھا خیر" راؤ نے کہا۔ "اب تمہارا اصرار ہے تو یوں ہی سہی۔ آؤ ایک ایک اور پی لیں۔" اعظم نے دو گلاس اور آرڈر کیے اور دونوں دوستوں نے پھر خاموشی کے ساتھ شراب پینی شروع کی۔!

"آپ کے پاس دیا سلائی تو نہیں ہے؟" راؤ کے برابر ایک انگریز مزدور کھڑا ہوا تھا اس

profakbar.blogspot.com

نے راؤ سے پوچھا، خاص مزدوروں کے لہجے میں۔ راؤ مڑا، اس نے سوال کرنے والے پر ایک نظر ڈالی اور اپنے جیب سے دیا سلائی کی ڈبیا نکال کر مزدور کے ہاتھ میں رکھ دی۔ مزدور نے اپنا پائپ سلگانا شروع کر دیا۔ جلتی ہوئی دیا سلائی کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ مسن آدمی تھا۔ چالیس پینتالیس برس کا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں جو اس کے لبوں تک پہنچی تھیں اور جن کے کنارے بیئر سے نم تھے۔ گہرا گلابی رنگ، ناک کچھ پھولی ہوئی سی، چھوٹی آنکھیں جن میں تیزی، بھنوئیں ہلکی بھوری، میانہ قد، کافی فربہ جسم، ہاتھوں کی موٹی موٹی انگلیاں۔ اس شخص کے کپڑے پرانے گہرے بادامی رنگ کے جو بالکل جھنا ہو گئے تھے۔ پتلون پر گھٹنے کے نزدیک پیوند۔ پائپ سلگا کر جب اس نے راؤ کو دیا سلائی کی ڈبیا واپس دی تو کہا،

"ہندوستان بھر میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔"

اعظم نے یہ سن کر اپنے دل میں کہا، پھر تم سے کیا مطلب! انہیں ان باتوں سے کیا مطلب خواہ مخواہ ہم سے بات چیت کرنے کی خواہش مت کرو۔ خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ اس وقت مجھے ہندوستان میں گڑبڑ ہونے کی وجہ معلوم کرنے کی فرصت نہیں۔" جمین، جمین، اس کے سر میں ابھی تک کلہاڑے چل رہے تھے۔ وہ خاموش رہا۔

اور راؤ نے خیال کیا وہ شخص کیوں ہم سے باتیں کرنا چاہتا ہے؟ ہندوستان سے اسے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ ہمیں غلام سمجھ کر ضرور دل میں نفرت کرتا ہوگا۔ اس کی اپنی حالت خراب سہی۔ لیکن اکثر انگریزوں کی طرح ہندوستان کو ہمارے ملک کو اپنا ذاتی ملک سمجھتا ہوگا۔ ہندوستان میں گولی چلی اس کے بھائی بندوں نے، ہمارے بھائی بندوں پر گولی چلائی۔ یہ دنیا بھر میں گولیاں چلا کر اور آسمان سے بم برسا کر تہذیب پھیلانا اور صلح اور امن قائم رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور یہ شخص مجھ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتا ہے؟" اس نے انگریز کو جواب دیا: "ہاں ہندوستان سے

بڑی خبر آتی ہے۔ لیکن مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ جتنی زیادہ ہندوستان میں گڑبڑ ہو مجھے تو اتنی ہی زیادہ خوشی ہوتی ہے۔" غصہ اور طنز سے بھرا ہوا کلمہ۔ لیکن اس ٹھوس انگریز مزدور پر راؤ کے غصے اور طنز کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ اس نے اپنے پائپ سے ایک کش لیا اور پھر بغیر کسی جوش و خروش کے جواب دیا: "میں یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے فساد، گڑبڑ، خون خرابے کی خبر سن کر خوشی نہیں ہوتی اور جب ہم انگریز ہندوستان میں جا کر بغیر فوج کی روزانہ مدد کے حکومت نہیں کر سکتے تو میں یہ کہتا ہوں" تھوڑی سی آواز اٹھا کر اس نے دوبارہ کہا "میں یہ کہتا ہوں کہ اب اس بات کا وقت آ گیا ہے کہ ہم ہندوستان سے اپنا بوریا بستر سنبھال کر گھر واپس چلے جائیں، اور ہندوستانیوں کو ان کا ملک حوالے کر دیں۔ وہ جو چاہیں اپنے ملک کو لے کر کریں اور بہر صورت میں تو یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ ہمارے انگلستان پر جرمنیا فرانسیسی یا اور کوئی قوم آ کر حکومت کرے تو پھر ہندوستان میں ہم کو رہنے کا کیا حق ہے؟" وہ دوسری طرف مڑا اور اپنے پاس والے مزدور کو خطاب کر کے کہا "کیوں جم۔ میں ٹھیک کہتا ہوں نا؟"

جم جو لمبا اور دبلا تھا اور جس کے چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، اپنے ساتھی ٹام کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور سر جھکائے ہوئے اپنے بیئر کے گلاس پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ ٹام کی باتیں سن کر جم نے پہلے کچھ جواب نہیں دیا۔ راؤ کے دل میں جو ایک نفرت سی ٹام کی طرف سے تھی۔ وہ اب دلچسپی سے بدل گئی۔ "یہ انگریز مزدور غالباً اتنے احمق نہیں جتنے انگلستان کے اخبار ڈیلی میل وغیرہ۔ ان کے دلوں میں سچائی کے لئے ابھی تک تھوڑی سی جگہ باقی ہے۔" لیکن راؤ کو پھر غصہ آیا "یہ کچھ کرتے کیوں نہیں!" راؤ نے جم کی طرف دیکھا۔ اسے اس کے جواب کا انتظار تھا۔ ٹام نے پھر جم سے کہا،

"بول جم، تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ٹام" جم نے آہستہ سے کہا: "لیکن اگر ہم ہندوستان کو چھوڑ دیں تو پھر اس ملک کی حالت

کیا ہوگی۔ ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ وہاں ہندو اور مسلمان دو مذہب کے لوگ ہیں اور ان میں ہمیشہ آپس میں لڑائی ہوا کرتی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ اگر ہم ہندوستان میں امن قائم نہ رکھیں اور اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں تو ہندوستان میں بہت خون خرابے کا ڈر ہے"

ٹام نے اپنا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ میں ساری بیئر ختم کر دی اور بآواز بولا "جم! میں تم سے کہتا ہوں میری بات سنو۔ میں لڑائی سے پہلے ہندوستان میں تھا اور میں نے وہاں کی حالت دیکھی ہے۔ اس وقت میں جوان تھا۔ میں احمق تھا۔ سنتے ہو جم! میں احمق تھا۔ برٹش امپائر کا خیال کر کے میری رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگتا تھا۔ میں ہندوستانیوں کو "کالا لوگ" "نگر" "نیٹو" کہہ کر خطاب کیا کرتا تھا۔ میں ہندوستانیوں کو جانوروں سے بدتر سمجھتا تھا۔ ہم لوگوں کو فوج میں سکھایا بھی جاتا تھا میں نے خود دیکھا ہے کہ ہم ہندوستانیوں میں کس طرح صلح قائم رکھتے ہیں! میں تم سے کہتا ہوں جم کہ ہندوستان میں ہماری حکومت کی بنیاد خوف پر ہے۔ تم کہتے ہو کہ ہندوستان میں ہماری وجہ سے امن قائم ہے۔ ممکن ہے مگر اس امن کی قیمت کیا ہے؟ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ غریب ننگے، بھوکے جو کیڑے مکوڑے کی طرح رہتے ہیں، لاکھوں کروڑوں انسان، مشکل سے تم یہ کہہ سکو گے کہ وہ انسان ہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں ہمارے یہاں بیکار مزدوروں کی حالت ان سے ہزار درجہ بہتر ہے اور اس پر بھی یہاں یہ شور و غل مچتا ہے، آئے دن جلسے ہوتے ہیں۔ جلوس نکلتے ہیں اور گورنمنٹ کو یہ جتلاتے ہیں کہ جب تک وہ بیکار مزدوروں کے اچھی طرح رہنے سہنے کا انتظام نہ کرے وہ مہذب گورنمنٹ کہلانے کے لائق نہیں۔ جم میری بات کا یقین مانو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ہندوستان میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہر جگہ غربت ہی غربت دیکھی۔ ہم وہاں ڈیڑھ سو برس سے زیادہ سے ہیں۔ اور صلح اور امن قائم کئے ہوئے ہیں! تم جب امن قائم رکھنے کی باتیں مجھ سے کرتے ہو تو مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔!

جم پر ٹام کی باتوں کا اثر ہوا مگر اُس کے دل میں شبہ سا رہ گیا۔ ممکن ہے ٹام مبالغہ کرتا ہو۔ ٹام تم ہندوستان جا چکے ہو، وہاں کی حالت دیکھ چکے ہو۔ مجھے جو کچھ ہندوستان کے بارے میں معلوم ہوا، اخباروں سے...... اور جم نے ہچکچا کر کہا: "اخباروں میں ہمیشہ لکھا رہتا ہے کہ اگر ہماری حکومت ہندوستان میں نہ رہے تو اس ملک میں بدامنی اور فساد پھیل جائیگا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔" جم نے سر ہلا کر کہا: "اخباروں میں یہ پڑھتا ہوں" ٹام کو اب کافی سرور آ چلا تھا۔ بحث کرنے سے اور زیادہ حرارت اس میں آگئی "جم" اس نے جم کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا: "بندۂ خدا! کیا تمہاری کھوپڑی بالکل خالی ہے؟" اس فقرے کو سن کر ادھر اُدھر جو لوگ تھے وہ سب اپنے اپنے گلاس لے کر ٹام اور جم کے نزدیک آگئے۔ اور اُن کے گرد حلقہ سا بن گیا۔ سب اُن کی گفتگو میں شامل ہونا چاہتے تھے۔

ٹام نے اپنی بات کو جاری رکھا: "تم کہتے ہو کہ تم نے یہ سب باتیں اخباروں میں پڑھی ہیں کس وجہ سے تم میری بات کا یقین کرنے سے انکار کرتے ہو۔ اچھا تم مجھے یہ بتاؤ کہ اخبار ہمارے اپنے بارے میں جو کچھ لکھتے ہیں وہ سچ ہوتا ہے؟ جب کبھی ہم مزدور اسٹرائک کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو یہ اخبار ہمیشہ قصور ہمارا ہی بتاتے ہیں۔ جیسے ہم کو فاقہ کرنے اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹنے میں مزہ آتا ہے۔ کیا تم اس کو سچ کہو گے؟ اور آج کل جو بیچارے بیکار مزدور جلسے کرتے ہیں اور جلوس نکالتے ہیں تاکہ وہ گورنمنٹ پر دباؤ ڈالیں کہ سارے ملک کی توجہ اپنی ردی حالت کی طرف مبذول کرائیں، تو اخبار کہتے ہیں کہ وہ سب اٹھائی گیرے، ننگے، ماسکو کے زر خرید غلام ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟ بتاؤ تم خود بتاؤ۔ تم میرے لڑکے کو جانتے ہو، وہ ایک کپڑے کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ ایک برس سے بیکار ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے۔ سڑکوں پر مارا مارا گھومتا پھرتا ہے، نوکری کی تلاش میں، لیکن جہاں کہیں بھی جاتا ہے وہاں ٹکا سا جواب ملتا ہے اُن نے

profakbar.blogspot.com

کیا تصور کیا ہے؟ اگر اس کو کام دیا جائے تو وہ ان لوگوں کو جو بڑی بڑی موٹروں پر گھومتے پھرتے ہیں کام کرنا سکھا دے میرے لڑکے کی طرح اس ملک میں ۳۰ لاکھ آدمی ہیں۔ ایسے لوگوں کو، ہمارے اخبار کہتے ہیں کہ بدمعاش اور اپاہج ہیں اور تم ایسے اخباروں کی باتوں کا یقین کرتے ہو؟ جم ذرا تو سمجھ کر باتیں کرو!"

جم بیچارہ یہ تقریر سننے کے بعد بالکل دب گیا، جو لوگ ادھر اُدھر کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی ٹام کو اس زور شور سے سن کر اسی کی طرفداری میں سر ہلانا شروع کیا۔

جم نے آہستہ سے کہا "ٹھیک ہے ٹام تمہارا ہی کہنا ٹھیک ہے۔ ان اخباروں کی باتوں کا یقین کرنا حماقت ہے۔"

ٹام اب بچے کی طرح خوشی سے مسکرانے لگا، جیسے اسے کوئی بڑی فتح ہوئی ہو۔ اس نے راؤ اور اعظم کی طرف نظر ڈالی اور مسکرا کر آنکھ ماری۔ گویا یہ کہنا چاہتا تھا "جم کو برا آدمی مت سمجھنا۔ دل اس کا بھی صاف ہے۔ ہندوستان کے حقوق کو وہ مانتا ہے۔ صرف ذرا سی بات تھی۔ جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور اب وہ ہمارے ساتھ ہے۔"

"جم اب میری طرف سے ایک گلاس بیئر" ٹام نے دو گلاس اور آرڈر کئے۔ ایک اپنے لئے اور ایک جم کے لئے۔ شراب کے اثر سے غریب آدمی بھی فیاض ہو جاتا ہے۔

"تھینک یو ٹام" جم نے مسکرا کر کہا۔ شراب والے نے بیئر سے لبریز دو گلاس ان کے سامنے رکھ دیئے جو لوگ گھیرے ہوئے کھڑے تھے وہ رفتہ رفتہ ہٹنا شروع ہوئے۔ ٹام اور جم نے ایک ایک گھونٹ بیئر لی کر پائپ کے لمبے لمبے کش لئے۔ اعظم نے دل میں سوچا کہ جلدی کرنی چاہیئے ایسا نہ ہو کہ بیٹی نعیم کے ہاں جائے اور اعظم کو وہاں نہ پا کر واپس چلی جائے۔

اتنے میں کمرے کے ایک کونے سے ایک شرابی کی زوردار آواز آئی۔ اس کے لہجے سے

معلوم ہوتا تھا کہ وہ بدمست ہے۔

"ہلو، بیٹی"۔ اس نے اعظم اور راؤ کو پکار کر کہا۔ اعظم اور راؤ یکبارگی اسکی طرف مڑے۔ ننگے سر ایک دبلا پتلا آدمی پھٹے حالوں، لال ٹماٹر کا سا چہرہ بنچ پر بیٹھا ہوا بدمستی کی ہنسی ہنس رہا تھا۔ راؤ اور اعظم جن پر خود شراب کا اثر ہو رہا تھا۔ غصہ سے کانپ گئے۔ ذلت ہے اور رسوائی۔ ہندوستانیوں کی قسمت ہی میں لکھی ہے۔ دنیا کے جس حصے میں بھی وہ جائیں۔ غلامی کا ٹیکہ ہرگز ان کے ماتھے سے نہیں چھوٹ سکتا۔ راؤ اور اعظم دونوں نے یہی محسوس کیا۔

"گیندی کیسا ہے...... اس کی بکری اچھی ہے؟ میں ہندوستان میں تھا میں ۳ برس میں، نہ تین برس ہندوستان میں فوج میں تھا۔ میں نے کلکتہ، دہلی، آگرہ، میرٹھ، پشاور سب دیکھا۔ کیلکٹا اچھا شہر ہے۔ میں نے خوب مزا کیا۔ ہندوستان میں لڑکیاں بہت اچھی ہوتی ہیں...... ہلو، کیا ہوا؟ میری طرف سب لوگ کیوں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں؟"

اس نے اپنا گلاس اٹھا کر جو تھوڑی سی بیئر بچی ہوئی تھی ایک گھونٹ میں ختم کر دی۔

"ایک اور" اس نے چلا کر شراب والے سے کہا۔

اس شخص کے چلانے کی وجہ سے پب میں ہر شخص کی نظر اس کی طرف تھی۔ انگریز مزدور اس طرف خاموشی سے اس طرح دیکھنے لگے جیسے انہیں اس کی یہ ناشائستہ حرکت بالکل پسند نہیں تھی۔ کسی کسی کے ماتھے پر تیوریاں تھیں۔ کوئی حقارت آمیز مسکراہٹ سے چلانے والے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اعظم کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح سے وہ اس بدمست ذلت کرنے والے سے بدلا لے۔ وہ اس کی طرف یوں گھور رہا تھا۔ جیسے اس

profakbar.blogspot.com

سمجھا بس چلے تو اُس شخص کو کچا کھا جائے۔ جینی کا خیال اُس وقت اُس کے ذہن سے بالکل نکل گیا۔
راؤ نے چلانے والے کی طرف ذرا دیر دیکھ کر اُس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور اپنے شراب کے گلاس پر نظر گڑا کر آہستہ سے کہا "سور کا بچہ" اور پھر گلاس اٹھا کر آہستہ آہستہ اپنی شراب پینی شروع کی۔ اس کا سر اب کچھ کچھ چکرانے لگا تھا۔ چاروں طرف خاکی کپڑے میں گورے، بائیسکلوں پر اس کے گرد ایک عظیم الشان حلقہ بنائے ہوئے ہیں اور بیچوں بیچ میں وہ کھڑا ہوا ہے، بالکل اکیلا، اس کے ہاتھ میں ایک شراب کا گلاس ہے آدھا بھرا ہوا، ہزار ہا، ٹھوکھا، گورے سائیکلوں پر۔ دیکایک رات ہو گئی۔ اندھیرا گھپ صرف گوروں کی سائیکلوں کے لیمپ کی روشنیاں۔ راؤ کو ڈر معلوم ہوا۔ اس کے گرد سائیکلوں کا حلقہ چھوٹا ہونے لگا۔ سائیکلوں پر گورے اُس کے قریب آنے لگے۔ ایک منٹ میں وہ بالکل اُس کے قریب پہنچ جائیں گے۔ یا خدا وہ اس بلا سے کیسے نجات پائے۔ ایک سیکنڈ میں وہ پس جائیگا۔ اس پر خوف طاری ہوا۔ اس کا بدن تھر تھرانے لگا ہائیں ہائیں! اسے مردانگی کے ساتھ اس بلا کا سامنا کرنا چاہیئے اس نے شراب کا گلاس زمین پر پٹک دیا۔

تڑ سے گلاس ٹوٹنے کی آواز آئی اور سب کی نظر راؤ پر پڑی۔

راؤ خود چونک سا گیا۔ اس نے شراب والے کی طرف دیکھ کر کہا: "آئی ایم سارّی۔ معاف کرنا۔" "کچھ مضائقہ نہیں سر" اُس نے مسکرا کر جواب دیا "اس بدمست آدمی کے چلانے کا آپ لوگ نوٹس مت لیجئے۔ ایک ہی گلاس پی کر اس کے ہوش درست نہیں رہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اُس نے آپ لوگوں کو پریشان کیا۔" شراب خانے والے نے اعظم اور راؤ سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

شرابی اب کسی اور سے چلا چلا کر باتیں کر رہا تھا۔

اعظم راؤ کی طرف مڑا "معلوم ہوتا ہے تمہارا سر چکرا رہا ہے۔ یہاں دھواں بہت

ہے۔ چلو چلیں۔"

دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ شام اور جم کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں، دونوں ساتھ اعظم اور راؤ کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ اور "گڈ نائٹ" کہا۔

اعظم اور راؤ بغیر جواب دیئے تیز کی سے پب کے باہر نکل آئے۔ اور ان دونوں پر ایک اندوہگیں سکوت چھا گیا۔

profakbar.blogspot.com

تیسرا باب

نعیم الدین ان طالب علموں کے زمرہ میں تھا جو ہندوستان سے دو یا تین برس کی تعلیم کے لئے انگلستان جاتے ہیں اور وہاں جا کر پانچ چھ برس تک رکتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ اپنے والدین کو خواہ مخواہ ستانا چاہتے ہیں اور ان پر انگلستان میں معینہ میعاد سے زیادہ رہنے کا بار ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی نہیں کہ وہ کند ذہنی کے سبب امتحان نہیں پاس کر سکتے۔ بلکہ اس لئے کہ ان کو سستی کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ وہی لوگ جو شروع میں اپنی ذہنی اور جسمانی تیزی کا ثبوت دیتے ہیں، سال چھ مہینے میں وہاں رہنے کے بعد رفتہ رفتہ سست ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ انگلستان میں جیسے چپک سے جاتے ہیں۔ طالب علم ہندوستان سے لندن آتے تھے، اور طالب علم لندن سے ہندوستان واپس جاتے تھے۔ مگر نعیم الدین لٹن سے مس ہونے کا نام نہ لیتے۔

"نعیم الدین! آخر تمہاری تھیسس کب ختم ہوگی؟" لوگ ان سے پوچھتے۔

"پانچواں باب لکھ رہا ہوں۔ چند ہفتوں میں وہ ختم ہو جائیگا۔ اس کے بعد بس ایک باب اور لکھنا ہے۔ مہینہ دو مہینے میں اسے پیش کر دوں گا۔" نعیم الدین ہمیشہ یہی جواب دیتے اور اس خوف سے کہ لوگ کہیں نہ کہیں کہ چھ مہینہ قبل بھی انہوں نے یہی جواب دیا تھا، وہ فوراً بات ٹالنے کی کوشش کرتے "سگریٹ پیو" وہ سوال کرنے والے کے سامنے سگریٹ پیش

کر کے کہتے اگر انہیں خوف ہوتا کہ وہ شخص بغیر بات کی تہ تک پہنچے ہوئے رکنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ تو نعیم الدین "ذرا معاف کرنا" کہہ کر اپنی آرام کرسی سے اٹھتے۔ گردن جھکی ہوئی، منہ میں پائپ دبا ہوا۔ بھکا بھک انجن کی طرح دھواں نکالتے ہوئے مع اپنے فربہ جسم کے تیزی سے کمرے سے باہر نکل جاتے اور غسل خانے میں جا کر نجات لیتے۔ ان کے دوست ان چالوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور یہ نعیم الدین کی چڑھ نکال لی تھی۔ گفتگو کے درمیان یا غیروں کے سامنے جب نعیم الدین اپنی عادت کے مطابق زور و شور سے باتیں کرتے ہوتے تو کوئی نہ کوئی ان سے ضرور پوچھتا "نعیم تم اپنی تھیسس کب پیش کرو گے؟" ایک دم نعیم بولتے بولتے رک جاتے۔ اور سوال کرنے والے کی طرف جھنجھلا کر دیکھتے "میری تھیسس سے یہاں کسی کو دلچسپی نہیں" اور پھر اپنی پہلی گفتگو جاری رکھنے کی بے تحاشا کوشش کرتے۔ اس پر ان کے دوست سب قہقہہ مار کر ہنستے۔

نعیم سے سب کو ایک محبت سی تھی۔ ہمیشہ ہر شخص کی مدد کرنے کے لئے تیار رہتے۔ اور ان سے وہ لوگ بھی جو ان کے دوست نہیں تھے، جائز ناجائز فائدہ اٹھاتے۔ کسی کے پاس روپیہ کی کمی ہوئی اور وہ نعیم کے یہاں قرض مانگنے پہنچا۔ کسی کو مفت دعوت کھانی ہوتی تو وہ نعیم کے یہاں کھانے کے وقت آ کر ڈٹ جاتا۔ کسی کے پاس تازہ ترین ناول پڑھنے کے لئے نہ ہوتے تو وہ نعیم کی کتابیں بے تکلفی سے اٹھا کر لے جاتا۔ کسی کو ٹیلنگ کرنی ہوتی تو وہ نعیم کے یہاں پہنچ کر اس سے لفافوں پر پتے لکھواتا۔ کسی کی معشوقہ اگر اسے داغ فراق دے جاتی تو وہ دلجوئی کے لئے نعیم کے یہاں آتا۔

نعیم الدین ہمیشہ پہلے انکار کرتے۔ "مجھے کہاں فرصت!" "یا" میں غریب آدمی میرے پاس پیسے کہاں کہ تم کو قرض دوں" "یا" اس وقت ذرا مجھے پڑھنا ہے۔ اس وجہ سے میں تمہارا کام نہیں کر سکتا۔"

profakbar.blogspot.com

لیکن سب کو معلوم تھا کہ پانچ منٹ کے اصرار کے بعد نعیم الدین کو ان کی آرام کرسی سے جس پر وہ صبح سے شام تک اپنا گاؤن پہنے بیٹھے ہوئے ناول پڑھا کرتے، کھسکایا جا سکتا ہے۔ اور پھر وہ دوسروں کی مدد کرنے میں تھوڑی دیر کے لئے اپنی سستی کو بالائے طاق رکھ دیتے۔

نعیم الدین کا کمرہ ان کے دوستوں، اور ان کے جان پہچان والے لوگوں کے لئے کلب کا بھی کام دیتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن شام کو چھ سات آدمی ضرور وہاں پہنچ جاتے اور پھر گفتگو کا سلسلہ چھڑ جاتا جو رات کے بارہ ایک بجے تک جاری رہتا۔ آج رات کو بھی نعیم کے یہاں پارٹی تھی۔

کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ "ہاں چلے آؤ" نعیم نے جواب دیا۔ اور اپنی کرسی سے اٹھ کر آتشدان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا دروازہ کھلا، آہستہ آہستہ کر کے۔

یہ کون ہے نعیم نے اپنے دل میں سوچا جو فوراً چلا نہیں آتا۔ بلکہ دروازے پر پہنچ کر گویا جھجک رہا ہے۔ جیسے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پہلی دفعہ آیا ہے۔

کمرے میں اندھیرا سا تھا۔ صرف ایک لیمپ، جس پر گہرے سرخ رنگ کا گلوب لگا ہوا تھا۔ ایک کونے میں نیچی سی میز پر روشن تھا۔ آتشدان میں آگ دہک رہی تھی۔

"چلے کیوں نہیں آتے؟" نعیم نے چلا کر دوبارہ کہا۔ ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی صورت اندھیرے میں اچھی طرح دکھائی نہیں دی، میانہ قد، گداز جسم، سیاہ لمبا کوٹ اور سیاہ ٹوپی جس کا چھجا اس کے ماتھے اور آنکھوں کے اوپر ہونے کی وجہ سے اس کے چہرے کو چھپائے ہوئے تھا۔ اس کی چال سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اندر آتے ہوئے جھجک رہی ہے

نعیم الدین حیران چپ کھڑا تھا اور آنے والی پر اس کی نظریں تھیں۔ "یہ ابھی سے کون آ گیا جسے میں جانتا تک نہیں، لیکن لڑکی مہذب معلوم ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی طرح نہیں جو جان نہ پہچان، دھڑلے سے میرے کمرے میں گھس آتے ہیں۔"

عورت نے دروازہ بند کیا اور ایک دو قدم آگے بڑھ کر نعیم کی طرف آئی۔ اب اس کے چہرے پر روشنی اچھی طرح پڑی۔ "لڑکی بدصورت نہیں" نعیم نے اپنے دل میں کہا۔

"معاف کیجیے گا۔" لڑکی نے کہا۔ "کیا یہ مسٹر نعیم کا کمرہ ہے؟"

"میرا ہی نام نعیم ہے۔ آئیے تشریف لائیے!" نعیم نے کہا اور آتشدان کے پاس سے بغیر ہلے ہوئے جواب دیا۔

لڑکی اب آگے بڑھ کر نعیم کے پاس گئی، کرسی کے نزدیک لیمپ کی پوری روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ اس کے گلابی گال جو سردی کی وجہ سے اور گلابی ہو گئے تھے اور ٹوپی کے نیچے سے نکلے ہوئے سنہرے بال جو گردن تک پہنچے تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جو نعیم کے چہرے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں، اس کے لبوں کی ہلکی سی مسکراہٹ جس سے کچھ خجالت سی معلوم ہوتی تھی۔ یہ سب ہلکی سرخ روشنی میں عجیب کیفیت پیدا کر رہے تھے۔

وہ کرسی کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی، اب اس کے اور نعیم کے درمیان صرف یہ بڑی سی آرام کرسی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کرسی پر رکھ دیئے۔ اس کی انگلیوں میں خفیف سی حرکت تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی مٹھی آدھی بند ہوتی اور پھر کھل جاتی۔ لیکن نعیم کی نظر اس کے ہاتھوں پر نہیں پڑی۔ وہ اس کی طرف استعجاب اور حیرت سے دیکھتا رہا۔

"مسٹر راؤ نے مجھ سے کہا تھا کہ آج شام کو آپ کے یہاں پارٹی ہے، انہوں نے مجھ سے یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا، ساڑھے چھ سات بجے، لیکن وہ ابھی تک نہیں آئے؟"

profakbar.blogspot.com

لڑکی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر، کچھ معذرت کے لہجے میں کہا۔ معلوم ہوتا تھا وہ اپنے کو بن بلایا مہمان سمجھ کر ایسے شخص کے یہاں آنے سے جسے وہ جانتی تک نہیں شرمندہ ہے۔

"ہاں ہاں!" نعیم نے جلدی سے کہا۔ "آپ تشریف رکھیے۔ راؤ کو کسی وجہ سے دیر ہو گئی ہو گی آج یہاں پارٹی تھی ..... راؤ تھوڑی دیر میں آتے ہی ہوں گے ..... آپ اپنا کوٹ اور ٹوپی اُتار دیجیے۔ باہر بارش ہو رہی ہے نا۔ آپ کے کپڑے بھیگ گئے ہوں گے"....

"جی ہاں" لڑکی نے کوٹ اور ٹوپی اتارتے ہوئے کہا۔ "ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے اور کُہر اس قدر ہے کہ دم گھٹتا ہے"..... اور پھر ذرا تھم کر اُس نے کہا۔ "راؤ نے آپ سے میرے یہاں آج آنے کے بارے میں ذکر تو کیا ہو گا"

نعیم نے لڑکی کا کوٹ اور ٹوپی کونے میں لے جا کر کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ پھر وہ جب مڑ کر آتشدان کے قریب آیا تو اُس نے دیکھا کہ لڑکی آئینہ کی طرف منہ کئے ہوئے جو آتشدان کے اوپر کارنس پر لگا ہوا تھا، اپنے بال ٹھیک کر رہی ہے۔ اک ذرا دیر کے لئے آدھے منٹ سے بھی کم۔ اسکے بعد وہ آتشدان کے بالکل قریب آگ کی طرف منہ کئے ہوئے کھڑی ہو گئی اور اپنے ہاتھ گرمانے لگی۔ وہ سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تھی، سیاہ اونی لہنگا اور اسی کپڑے کا ایک چھوٹا سا سیاہ کوٹ، اس کوٹ کے نیچے بہت گہرے نارنجی رنگ کا سوئٹر جو اس کے گلے کے چاروں طرف اور سامنے کوٹ کے کھلے ہوئے حصے سے دکھائی دیتا تھا۔ آگ دہک رہی تھی اور اس کے اُبھرتے ہوئے شعلوں کی روشنی رہ رہ کر اُس لڑکی کے چہرے کو چمکا دیتی تھی۔

نعیم الدین کو یہ لڑکی پسند آئی۔ "بیچاری نیک معلوم ہوتی ہے"۔ اُس نے اپنے دل میں خیال کیا۔ اور سمجھ دار بھی۔ تعجب ہے کہ راؤ نے کبھی پہلے مجھ سے اس لڑکی کا ذکر نہیں کیا۔ اور بھی اُس نے مجھ سے نہیں کہا کہ آج اسے مدعو کیا ہے۔ لیکن اگر اتنی کم لڑکیوں سے

دوستی ہے کہ ان کا شمار ممکن نہیں! معلوم ہوتا ہے یہ تازہ ترین ہے۔ اب اسے میں کیا جواب دوں اگر یہ کہتا ہوں کہ راؤ نے مجھ سے اس کا ذکر پہلے نہیں کیا تو وہ بے چاری خواہ مخواہ شرمندہ ہو گی دل میں سوچے گی کہ کہیں میرے اوپر بار تو نہیں ہو رہی ہے۔ راؤ بھی عجیب آدمی ہے، آخر میرے یہاں بلایا تھا تو کم از کم مجھ سے کہہ تو دیا ہوتا۔ نعیم دل ہی دل میں جھنجھلایا۔ اب میں کیا کروں خواہ مخواہ اس نے اس کشمکش میں پھنسایا۔ آخر میں اسے کیا جواب دوں۔ نعیم الدین کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ "کیا کروں! کیا کہوں"! اس کے سُست ذہن میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔

لڑکی خاموش آتشدان کے پاس کھڑی ہوئی اپنے ہاتھ گرماتی رہی۔ اُسے یاد بھی نہیں رہا کہ اُس نے کوئی سوال کیا تھا۔ اُس کے چہرے سے اطمینان معلوم ہوتا تھا۔ "راؤ تھوڑی دیر میں آجائیگا، شاید میں وقت سے کچھ پہلے پہنچ گئی، لیکن اچھا ہی ہوا۔ کیا اچھی آگ یہاں جل رہی ہے۔ اور یہ موٹا سا ہندوستانی طالب علم یہ بھی بے چارہ اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے"۔

نعیم الدین کی پریشانی اب بہت بڑھ گئی تھی۔ "آخر کچھ تو کرنا چاہیئے"۔ وہ اپنی جگہ سے تیزی کے ساتھ کمرے کے دوسرے سرے کی طرف گیا، اور اپنے کوٹ کی جیب سے، جو کھونٹی پر ٹنگا ہوا تھا گھبرا کر سگریٹ کیس نکالا اور لپک کر لڑکی کے پاس آیا۔

"سگریٹ نوش فرمایئے"۔ اُس نے ہانپتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

لڑکی نعیم کی طرف مڑی۔ "بہت بہت شکریہ" اور کہہ کر اُس نے کیس میں سے ایک سگریٹ نکال لیا۔ نعیم الدین نے خود بھی لیا اور پھر دونوں نے سگریٹ جلائے۔ اب نعیم کو ذرا سکون ہوا۔ "خیر بات ٹل گئی"۔

"آپ اِس کرسی پر آرام سے بیٹھئے"۔ اُس نے گفتگو شروع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

prafakbar.blogspot.com

"شکریہ۔ آگ کے قریب مجھے بہت آرام ہے ..... لیکن ..... اچھی بات ہے میں بیٹھتی ہوں۔ یہ کرسی بھی تو آگ کے پاس ہے۔ مگر میں نے آپ کی کرسی چھینی نا۔ آپ خود کہاں بیٹھیں گے"؟ لڑکی نے ہنس کر کہا۔

"میری فکر نہ کیجیے۔ میں اس دوسری کرسی پر بیٹھ کر جاؤں گا۔" اُس نے ایک چھوٹی سی بے ہتھے کی کرسی آگ کے قریب، بڑی کرسی کے سامنے کھینچی اور اُس پر بیٹھ گیا۔

"آخر یہ کون ہے، کیا کرتی ہے، راؤ اس سے کہاں ملا ہوگا۔ خوبصورت لڑکی ہے۔ خوبصورت! لیکن میں، مجھے کوئی خوبصورت کہہ سکتا ہے، مجھ پر کوئی لڑکی عاشق نہیں ہوتی اس کی آخر کیا وجہ ہے۔ میں موٹا بہت ہوں۔ میرے اور عشق کے درمیان میری توند حائل ہے معلوم نہیں یہ لڑکی کیا سمجھتی ہے۔ توند سے کیا ہوتا ہے۔ اکثر دنیا کے بڑے بڑے انسانوں کی توندیں تھیں لیکن اگر توند نہیں تو پھر کون سی چیز۔ شاید مجھے عورت سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں اب یہ لڑکی اتنی دیر سے یہاں ہے اور مجھ سے ایک بھی ٹھکانے کی بات نہیں کی جاتی اپنے دل میں خیال کرتی ہوگی کہ کتنا غیر دلچسپ، گھامڑ آدمی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ ایسے لوگ جن سے دو لفظ بھی ٹھکانے سے نہیں بولے جاتے۔ عشق میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پھر آخر مجھ میں کونسی کمی ہے، میرے دوست خیال کرتے ہیں کہ مجھے ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں۔ اچھی صورت دیکھ کر مجھ پر ذرا اثر نہیں ہوتا۔ غلط، بالکل غلط "مرا در دلیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد" دوسرا مصرع اس وقت یاد نہیں آتا۔ کیا یہ سچ ہے کہ میرا حافظہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے میں یہاں برسوں سے اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ میں کند ذہن تو نہیں ہو گیا؟ اسکول میں جو ایک لڑکا میرے ساتھ بیٹھتا تھا۔ اُس کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں تھی۔ اور حساب میں وہ بیچارہ ہمیشہ فیل ہوتا تھا۔ میں تو کبھی اپنے اسکول اور کالج کے امتحانوں میں فیل نہیں

ہوا۔ بلکہ ہمیشہ شان کے ساتھ پاس ہوتا تھا۔ میں کند ذہن! کون کہتا ہے۔ میر اور غالب کے مجھے جتنے شعر یاد ہیں شاید ہی کسی کو ہوں گے مجھ سے کوئی بیت بازی کرلے۔ دیکھیں کون جیتتا ہے۔ کیا اس وقت ایک حرف بھی مجھ سے بولا نہ جائیگا۔ اتنی دیر میں یہ بیچاری بیٹھی ہوئی ہے اور میں نے اس سے ایک بات بھی نہیں کی۔

"کیا آپ بھی مسٹر راؤ کی طرح قانون پڑھتے ہیں؟" لڑکی نے پوچھا۔ وہ کرسی پر اب آدھی لیٹ گئی تھی اور سگریٹ کا دھواں اس کے چہرے اور بالوں پر ایک دھندلے سے نیلے نقاب کی طرح چھایا ہوا تھا۔

دیکھا نا! آخر میری خاموشی سے تنگ آکر اُسی کو بولنا پڑا۔ نعیم نے اپنے دل میں کہا۔

"جی نہیں" اُس نے جواب دیا۔ "میں تاریخ کا طالب علم ہوں۔ لندن یونیورسٹی کی ڈاکٹری کی کوشش کر رہا ہوں۔" کوشش" یہ لفظ میں نے خوب استعمال کیا۔ نعیم نے سوچا میرے ساتھ جن لوگوں نے کام کرنا شروع کیا تھا۔ وہ کب کے ختم بھی کر چکے۔ نعیم کو اپنے اوپر کچھ ہنسی سی آئی۔ لیکن وہ اسے پی گیا۔

اس کی نظر ..... لڑکی کی ٹانگوں کے اس حصہ پر پڑی جو چند انچ اس کے لہنگے سے باہر تھا۔

"کیا آپ بھی طالب علم ہیں؟" نعیم نے لڑکی سے پوچھا۔ "آخر میں نے پہلے ہی یہ سوال کیوں نہیں کیا۔" "نہیں اور ہاں۔" لڑکی نے ہنس کر جواب دیا۔ "میں پارسال تک یونیورسٹی کالج میں پڑھتی تھی پھر میرے پاس فیس دینے کے لئے کافی روپے نہیں رہے تو مجھے کالج چھوڑ دینا پڑا۔ اب میں دن کو ایک دفتر میں کام کرتی ہوں اور ہفتہ میں ۴ دفعہ رات کے کالج میں لیکچر سننے جاتی ہوں جہاں مجھے برائے نام فیس دینا ہوتی ہے۔"

profakbar.blogspot.com

یہ جواب نعیم کے سینے میں تیر کی طرح لگا۔ وہ جس کے پاس روپیوں کی کوئی کمی نہیں جو اپنی روزی کمانے کی فکر نہیں کرتا ہے، وہ کس طرح اپنے اوقات گزارتا ہے؟ اس کی تعلیم ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ وہ اپنے دوستوں کے مذاق کا مستقل نشانہ بن کر رہ گیا ہے۔۔ لیکن ہندوستانی تاریخ کے ایک تاریک عہد پر تھیسس لکھنا اور رات ہے، اور شام کو گھنٹہ دو گھنٹے لکچر سن لینا جو ایک کان سے سنا، دوسرے سے اڑا دیا۔ اور رات ہے میری تھیسس جب تیار ہوگی تو وہ علم تاریخ میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگی۔

"آپ کس مضمون پر لکچر سننے جاتی ہیں؟"

آرٹ اور فلسفہ پر لڑکی نے جواب دیا۔ "آپ کو ان مضامین سے دلچسپی ہے؟" اس نے پوچھا۔

آرٹ اور فلسفہ! یا اللہ خیر۔ یہ تو بڑی عالم فاضل صاحبزادی معلوم ہوتی ہیں۔ میں اس کے سوال کا کیا جواب دوں؟ کیا مجھے آرٹ اور فلسفہ سے دلچسپی ہے؟ اگر میں نے ہاں کہہ دیا اور اس نے آرٹ اور فلسفہ پر باتیں چھیڑ دیں اور میں نے کوئی حماقت کی بات کر دی تو پھر یہ اپنے دل میں کیا سوچے گی! یا کہیں ایسا تو نہیں کہ صرف مجھ پر رعب جمانے کے لئے اس نے مجھ سے یہ کہا ہے؟

"دلچسپی تو مجھے ضرور ہے" نعیم نے جواب دیا۔ "لیکن میں نے کبھی ان مضامین کو اچھی طرح سے پڑھا نہیں ہے۔ اس وجہ سے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ دراصل آرٹ ٹھیک سے میری سمجھ میں آتا ہے یا نہیں، رہ گیا فلسفہ اس کا ماہر ہونے کے لئے تو ایک عمر درکار ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ آپ کو ایسے خشک مضمون سے دلچسپی ہے۔ عورتیں تو عام طور سے ادبیات میں زیادہ دلچسپی لیتی ہیں۔"

آپ یہ نہ سمجھیے کہ میں ان مضامین میں بہت ماہر ہوں۔ اسکول اور کالج میں ادبیات پڑھتے پڑھتے میں عاجز آ گئی۔ مجھے دو برس تک لٹریچر سے اتنی دلچسپی تھی۔

تھی خصوصاً شاعری سے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن اب مجھ میں عجیب تبدیلی ہو گئی ہے۔ شاعری کا خیال کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فلسفہ سچ پوچھیے تو میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن اس کے لکچر سننے اور اس کی کتابیں پڑھنے سے مجھے اطمینان سا ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی بڑے مصور کی بنائی ہوئی تصویر دیکھنے سے دل کو سکون ہوتا ہے ....." لڑکی کی آنکھیں جو نیچی تھیں اٹھیں اور اس نے نعیم الدین کی طرف دیکھا۔ "لیکن آپ کہتے ہوں گے کہ میں یہ کیسے خرافات بک رہی ہوں۔" اس نے ایک غمگین مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

نعیم دل ہی دل میں شرمندہ تھا۔ کیسے برا خیال بھی اس طرف گیا کہ یہ مجھ پر رعب جمانے کے لئے اس طرح کی باتیں کرتی ہے۔ کیا اس کا چہرہ اور اس کی آنکھیں اس کی سچائی کی گواہ نہیں؟

"نہیں نہیں آپ بالکل یہ خیال نہ کیجئے۔ میں آپ کی باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہا ہوں مجھے اس کا موقع بہت کم ملتا ہے کہ یہاں کی سمجھ دار عورتوں سے باتیں کروں! اور ہمارے یہاں ہندوستان میں تو آپ جانتی ہیں کہ مرد اور عورتیں خصوصاً نوجوان اس طرح سے بیٹھ کر باتیں نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے ....." نعیم نے معذرت کے لہجے میں کہا۔ "لیکن اسے چھوڑیئے۔ آپ مجھے یہ بتایئے کہ آپ کو لٹریچر خصوصاً شاعری سے کیوں دلچسپی باقی نہیں رہی؟ ہمارے یہاں تو ہر پڑھا لکھا آدمی شاعری میں ڈوبا ہوا رہتا ہے بات چیت کے درمیان، تقریروں میں، مضامین کے اندر ہر جگہ مناسب شعر پڑھنا قریب قریب ضروری ہے۔"

"کیا آپ کے یہاں ہر وقت لوگ شعر پڑھا کرتے ہیں! اس سے بڑھ کر خوفناک حرکت کیا ہو سکتی ہے! اگر مجھے اس قسم کی سوسائٹی میں رہنا ہوتا تو پاگل ہو جاؤں، شاعری، اچھی شاعری کا اثر میرے اوپر ایسا ہوتا ہے۔ جیسے گرمیوں کی خوشگوار رات اور چاندنی کا جب دن کی روشنی کو ہم

prafakar.blogspot.com

بھول جاتے ہیں اور ہر چیز پر ہر بدہیئت، بدصورت، بیکار چیز پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ ایسا پردہ جو انہیں بالکل چھپاتا نہیں بلکہ صرف ان کے عیوب کو جو دن کے وقت آنکھوں میں چبھتے ہیں، ڈھانک دیتا ہے۔ یہ دھوئیں کا سارا پہلا نقاب ہمارے دل اور ہمارے ذہن دونوں پر چھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہماری روح کبھی مسرت کے ایک بے پایاں سمندر میں غرق ہو جاتی ہے اور کبھی..... اس کے درد کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔" معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے۔ اس کی نظر آگ کے شعلوں پر جمی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ اڑ گئی وہ کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ایک لمحہ کے لئے رک کر اس نے کہا: "اسی وجہ سے مجھے شاعری اب پسند نہیں۔ میں اس کے اثر کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

نعیم کے دل میں بے ساختہ خواہش ہوئی کہ وہ اس لڑکی کے حالات معلوم کرے وہ چاہتا تھا کہ وہ بولتی چلی جائے۔ اس کی آواز بہتے ہوئے چشمے کی آواز کی طرح تھی۔ نعیم نہیں چاہتا تھا کہ وہ خود اپنی آواز سنے۔ "یہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے۔

اس کی زندگی دلچسپیوں سے لبریز ہوگی۔ کیا یہ عشق میں مبتلا ہے؟ کیا معلوم اس کا عشق کس قسم کا ہے؟ اسے ضرور اپنے عشق میں مایوسی ہوئی ہوگی۔ جبھی اس طرح سے باتیں کر رہی ہے اس کا عاشق کس قسم کا آدمی ہوگا؟"

نعیم نے محسوس کیا کہ اسے یہ خیال تک برا معلوم ہوا۔ مجھ سے کیا مطلب لیکن پھر بھی اس کی باتوں میں مایوسی ملی ہوئی ہے۔" نعیم کو اس خیال سے خوشی سی ہوئی۔" یہ گفتگو کرتے کرتے یکبارگی رک کیوں گئی؟ مجھے اب کچھ کہنا چاہیئے! کیا کہوں؟ اس کی پنڈلیاں کتنی خوب صورت ہیں اور اس کی انگلیاں بھی۔ اسے کچھ پریشانی سی ہو رہی ہے۔ کہیں یہ مجھے ٹھس اور غیر دلچسپ تو نہیں سمجھ رہی ہے؟ میں اس کی بات کا کیا جواب دوں؟ یہ خاموشی تکلیف دہ ہوتی

جا رہی تھی۔ شاعری کی باتیں ہو رہی تھیں۔ آگ کے شعلوں کو دیکھو کس طرح سے ناچ رہے ہیں۔ میں موٹا ہونے کی وجہ سے ناچتے وقت ضرور بدنما معلوم ہوتا ہوں گا۔ آخر میں کیوں موٹا ہوں؟ سب میری اپنی سستی کا نتیجہ ہے۔ فرانسیسی شاعر تھافانہ جس نے کہا ہے۔ سستی زندہ باد! یہ ہے میری معشوقہ۔ یہ مصرع مجھ پر بالکل صحیح اترتا ہے۔ کیا موٹا ہونا بہت بڑا عیب ہے؟ بہت موٹا تو میں نہیں۔ معلوم نہیں یہ لڑکی مجھے دیکھ کر اپنے دل میں کیا کہتی ہوگی! کیا معلوم شاید اس کا خیال میری طرف بالکل گیا ہی نہ ہو۔ اپنے خیال میں یہ کس قدر محو معلوم ہوتی ہے۔ مگر مجھے کچھ تو اب کہنا چاہیئے۔ ہمارے یہاں ناچنا کتنا معیوب سمجھا جاتا ہے، بھانڈوں اور طوائفوں کا پیشہ اور اگر مرد اور عورت کو ساتھ مل کر ناچتے ہوئے ہمارے مولوی صاحبان ملاحظہ کریں تو ان کے دل کی حرکت رک جائے۔ ہماری شاعری دراصل.....

ممکن ہے ہم ہندوستانیوں کے سست ہونے کی یہی وجہ ہے کہ ہم ہر وقت شاعری میں ڈوبے رہتے ہیں آپ کہتی ہیں کہ شاعری کا اثر ہمارے دل اور دماغ کو تھوڑی دیر کے لئے معطل کر دیتا ہے۔ یا کم از کم انھیں اصلیت سے ہٹا کر ایک خیالی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ اور خیالی دنیا میں رہتے رہتے ہم اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ مکان و زمان چونکہ لامتناہی ہیں اس لئے ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بھی لامتناہی ہیں ہر انسان کے دل میں اپنے کو زندہ جاوید سمجھنے کی چھپی ہوئی خواہش ہوتی ہے۔ شاعری کے ذریعہ سے ہم اپنی یہ پیاس بجھاتے ہیں عقل ہم سے کہتی ہے کہ یہ سراسر حماقت ہے۔ لیکن شاعری کے ذریعے سے ہم عقل کو بھی زیر کر سکتے ہیں۔ ہماری شاعری عقل کی برائیوں سے بھری پڑی ہے۔ عقل ہمیں مشکلوں اور تکلیفوں کی طرف کھینچتی ہے۔ عقل ہمیں دھوکا دے سکتی ہے۔ لیکن شاعری کی شراب! آپ نے خود کہا کہ اس کا اثر ہمیں سست کر دیتا ہے اور اگر ہمیں یہ مستی، یہ بے خودی کی حالت، یہ بے عقلی، کبھی خوشی اور

profakbar.blogspot.com

کبھی غم کے دریا میں اس طرح غرق کر دیتی ہے کہ ہم اپنی انسانیت تک کو بھول جاتے ہیں اور محض ایک نغمۂ مسرت یا ایک نالۂ جانگداز ہو کر رہ جاتے ہیں کیا ہمیں اس چیز سے پرہیز نہیں کرنا چاہیئے"

نعیم یکبارگی رک گیا۔ "میں کیا بے مجھے بولتا جا رہا ہوں۔ کہیں یہ لڑکی یہ نہ خیال کرے کہ صرف اپنی فلسفیت کا ثبوت دینے کے لئے میں اس طرح کی باتیں کر رہا ہوں۔" لیکن اسے کچھ خوشی سی تھی۔ آخر کچھ تو اس سے بولا گیا۔ "یہ لڑکی مجھے بالکل ہی بے وقوف تو نہیں سمجھے گی میں دراصل بیوقوف نہیں مجھ میں کافی سمجھ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ موقع پر کبھی کبھی ٹھیک چبھتا ہوا جواب مجھ سے نہیں دیا جاتا۔ اس لڑکی کے لب کتنے اچھے ہیں اور بغیر لالی لگائے ہوئے عنابی ہیں۔ اس کا نام کیا ہے؟ اس نے مجھے اپنا نام کیوں نہیں ابھی تک بتایا؟ اس کے بال کاش کہ میں انہیں چھو سکتا۔ تو یہ کیا کیا بے تکے خیال مجھے آ رہے ہیں۔ نغمۂ مسرت یا نالۂ جانگداز۔ ظفر کا شعر یاد آ رہا ہے۔

میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا!
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

اور غالب:۔

سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن — شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اور میر:۔

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اٹھ اٹھ روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

اور میر انیس:۔

یک بیک طبل بجا، فوج کے گرجے بادل — کوہ تھرائے زمیں ہل گئی گونجا جنگل

طبل کی آواز، رونے کی آواز، نغمہ کی آواز اور دل کے ٹوٹنے کی آواز۔ اس لڑکی کے بولنے کی آواز مجھے کیوں پسند ہے؟

"آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہے۔ لیکن افسوس! ہم گا گا کر زندگی کی تلخ حقیقت کو نہیں بھلا سکتے!" لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔

"ہمیشہ کے لئے نہیں تو تھوڑی دیر کے لئے بھی نہیں؟ زندگی کی حقیقت اگر تلخ ہے تو اسے بھلانا ہی بہتر ہے۔"

"نہیں، ہرگز نہیں۔ حقیقت کو بھلا دینا کبھی بہتر نہیں ہو سکتا۔ اس خواب، سنہرے خواب کے بعد جب ہماری آنکھیں کھلیں گی تو زندگی کو ہم اور زیادہ تلخ اور زیادہ تاریک اور زیادہ مشکل پائیں گے۔"

"اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ زندگی، ساری زندگی، ایک تکلیف دہ، ناقابلِ برداشت بھاری بوجھ ہے اور ہم کبھی بھی اس سے نجات نہیں پا سکتے! یہ خیال تو ہولناک ہے۔ آپ کیسے ایسا عقیدہ رکھ کر زندہ رہ سکتی ہیں؟"

مجھے خود اس بات پر تعجب ہوتا تھا! میں کیوں زندہ ہوں؟ میں خود سے سوال کیا کرتی تھی۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مجھے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ میں اس سے بھاگنے کی کوشش کرتی تھی۔ زندگی کی روانی مجھے لوریاں دیتی تھی۔ آپ نے جن خوابوں کا ذکر کیا ہے وہ میری روح کو تھوڑی دیر کے لئے بے حس کر دیتے تھے۔ لیکن یہ کیفیت دیر تک قائم نہیں رہتی تھی۔ میری ہستی کا نقطۂ عمل نہیں ہوتا تھا اور میں ایک بے لنگر بادبان کشتی کی طرح زندگی کی تیز و تند ہواؤں کے طوفان میں ادھر ادھر تھپیڑے کھاتی پھرتی تھی۔ یہ تھا ناقابلِ برداشت بھاری بوجھ۔ یہ زندگی نہیں تھی، یہ زندہ درگور ہونا تھا۔ یہ موت تھی۔ گویا

protakbar.blogspot.com

ہماری سانس جاری ہو، ہماری رگوں میں خون رواں ہو لیکن ہم مردہ ہوں، ہماری روح مردہ ہو اس سے بڑھ کر کوئی چیز ہولناک نہیں۔ یہ چلتے پھرتے مردے، کتنے مکروہ، کتنے بھیانک، کتنے بدصورت ہیں۔"

وہ کرسی پر پھر آدھی لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں کمرے کے سیاہ پردوں پر جو قد آدم کھڑکیوں پر پڑے ہوئے تھے۔ گڑی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

کمرے میں بالکل خاموشی چھا گئی، صرف آگ کے جلنے کی خشک سی سرسراہٹ اور باہر سڑک پر چلتی ہوئی موٹروں کی دور دراز آواز۔

"کیا میں بھی چلتا پھرتا مردہ ہوں؟" نعیم نے یکبارگی خیال کیا اور اس کی ساری روح سکڑ کر تھرا سی گئی۔ جیسے اس نے غلطی سے بجلی کا تار چھو لیا ہو۔

"پھر آخر زندگی کے پیہم سوال کا آپ نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے اسے سنا، اسے محسوس کیا، اسے سمجھنا چاہا اور اسے معنی پہنانے کی پیہم کوشش کر رہی ہوں۔"

"اور آپ کے نزدیک اس جد و جہد، اس روحانی اور جسمانی مشقت کے بعد زندگی کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے؟"

"اس بوجھ کا ہلکا کرنا ہمارا مقصد ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے۔ لیکن ہم اس بیش بہا پتھر کو تراش کر اسے اور زیادہ قیمتی اور قابل قدر اور زیادہ خوب صورت بنا سکتے ہیں۔"

"اس محنت کی اُجرت؟ اس کا انعام؟"

"زندگی" لڑکی نے بہت دھیرے سے کہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور سیاہ پردوں کو ہٹا کر اس نے کھڑکی کے باہر نظر ڈالی۔ کہر اب دستور چھایا ہوا تھا۔ اور نیچے سڑک پر اِدھر اُدھر بجلی کی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ اور روشنی کے حلقوں کے چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی

چوتھا باب

دو شخص اور نعیم کے کمرے میں داخل ہوئے ایک ہندستانی لڑکی اور اس کے ساتھ ایک لڑکا۔ دونوں طالب علم۔

"آیئے عارف صاحب" نعیم الدین نے کہا۔ "مزاج اچھے ہیں۔ آپ دونوں تشریف لائے۔ مجھے بڑی خوشی ہے۔ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ میرا رقعہ آپ کو وقت سے نہ ملے اور آپ آ نہ سکیں" اور لڑکی کی طرف مڑ کر "کریمہ بیگم آپ آج کل کہاں رہتی ہیں؟ میں تو دو مہینے بعد آپ سے مل رہا ہوں۔ کوٹ اتار ڈالئے آپ دونوں۔ اور آیئے یہاں آگ کے قریب بیٹھئے۔ میں اس کوچ کو اور آگ کے پاس کھینچ دیتا ہوں۔ کیسا خراب موسم ہے اور آپ دونوں تو یہاں سے بہت دور رہتے ہیں۔ ایک آرلس کورٹ اور ایک گولڈرس گرین۔ آپ کا ساتھ کہاں ہو گیا؟" وہ بغیر اپنے مہمانوں کے جواب کا انتظار کئے ہوئے مسلسل بولتا جا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ کمرے میں اِدھر اُدھر کرسیاں وغیرہ ٹھیک کرتا جاتا تھا۔ کتاب، کاغذ، اخبار کمرے میں چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔ کوچ اس نے صاف کی اور اسے آگ کے سامنے کھینچ لایا۔ ایک سگریٹ کی خاکدانی اس کی کرسی کے پاس نیچے فرش پر رکھی ہوئی تھی، اس کو ٹھوکر لگی اور خاک تمام قالین پر بکھر گئی۔

profakbar.blogspot.com

دونوں نو وارد دروازے سے دو تین قدم آگے بڑھ کر کچھ ٹھٹھک کر رہ گئے۔ ان کی نظر انگریز لڑکی پر پڑی جو ان کی طرف پیٹھ کئے ہوئے دو سیاہ پردوں کے درمیان کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی باہر سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کمرے کی دھندلی روشنی، نعیم کی گھبراہٹ، اور اس کا ایک لڑکی کے ساتھ اکیلا ہونا۔ انہوں نے ان سب باتوں کو ملا کر اپنے ذہن میں ایک مکمل تصویر بنالی اور ان کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نظر آئی۔

"معاف کیجئے گا۔ کہیں ہم لوگ وقت سے پہلے تو نہیں آگئے اور آپ کو زحمت دی۔" عارف نے کہا۔

"یہ قصور میرا ہے" کریمہ بیگم نے چہک کر کہا۔ "میں نے عارف صاحب کو طالب علموں کی ایسوسی ایشن میں دیکھا جہاں میں لیکچر سننے گئی تھی لیکچر وقت سے پہلے ختم ہو گیا تو میں نے عارف صاحب سے آپ کے یہاں آنے کے بارے میں ذکر کیا انہوں نے کہا کہ ان کا بھی بلاوا ہے بس ہم دونوں بغیر وقت دیکھے ہوئے چلے آئے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے انگریز لڑکی کی طرف دیکھا جو اب پلٹ کر ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

مگر نعیم ابھی تک کچھ ایسا گم سا تھا کہ اس نے ان دونوں کے اشاروں اور کنایوں کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔

"نہیں میرے خیال میں آپ ٹھیک وقت سے آئے ہیں۔ مجھے آپ کے آنے سے زحمت کیوں ہونے لگی؟" نعیم نے کچھ گھبرا کر پوچھا۔

انگریز لڑکی اب کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر آتشدان کی طرف آگئی۔ عارف اور کریمہ بھی قریب آکر بیٹھ گئے۔ اور ان تینوں نے ایک دوسرے پر نظر ڈالی۔ نعیم نے عارف اور کریمہ

کے کوٹ لے جا کر کونے میں کھونٹی پر ٹانگ دیئے۔

پھر اس نے واپس آکر سب کو سگریٹ پیش کئے۔

"جی نہیں، شکریہ، میں سگریٹ نہیں پیتی" مکھنی پتلیوں کی سی مہین آواز میں کریمہ نے کہا۔

نعیم الدین نے زور سے سگریٹ کا ایک کش لیا اسے کچھ سکون ہونے لگا۔ اس کی حالت اس درخت کی سی تھی جو تیز آندھی میں جڑ تک ہل گیا ہو اب رفتہ رفتہ وہ اپنی معمولی حالت پر پہنچ رہا تھا

"میں نے آپ لوگوں کا ان خاتون سے تعارف نہیں کرایا۔ معاف کیجئے گا۔ یہ مسٹر عارف ہیں" اس نے عارف کی طرف جھک کر کہا اور بس وہ رک گیا اور انگریز لڑکی کی طرف مسکرا کر کہا۔ "مجھے آپ کا نام ابھی تک معلوم نہیں!"

لڑکی مسکرائی۔ اس نے عارف سے ہاتھ ملا کر کہا "میرا نام شیلا ہے۔ شیلا گرین" وہ کریمہ کی طرف مڑی اور اس سے اسی طرح اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"نعیم صاحب روشنی اور نہیں ہو سکتی؟ اس اندھیرے میں تو صورت بھی اچھی طرح دکھائی نہیں دیتی" عارف نے اپنے پتلون کی کریز ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں ضرور" اور یہ کہہ کر نعیم نے کمرے کے بیچ میں چھت سے جو لیمپ لٹکا ہوا تھا جلا دیا۔ چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔

عارف پورا جنٹلمین معلوم ہوتا تھا۔ اس کا سوٹ دس گنی کا ہوگا۔ اور اس کی صورت سے یہ ٹپکتا تھا کہ اسے اس بات کا احساس بھی ہے۔ وہ شیلا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس لئے کہ اس خوب صورت لڑکی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے۔

"کیا خیال ہے آپ کا اس موسم کے بارے میں؟" اس نے بالکل انگریزی لہجے میں بولنے کی کوشش کرتے ہوئے شیلا سے کہا۔

profakbar.blogspot.com

"احمق" نعیم الدین نے اپنے دل میں خیال کیا "اسے سوائے موسم کی باتیں کرنے کے اور کچھ نہیں آتا۔" اسے کچھ جھنجلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ اسے عارف کی مسکراہٹ پر غصہ آیا۔ "یہ کیا سمجھتا ہے اپنے کو شاید بہت حسین خیال کرتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اس کی ایک نظر میں ایسا جادو ہے کہ جس عورت کو جی چاہے وہ اپنا غلام بنا سکتا ہے۔"

"میرا موسم کے بارے میں کیا خیال ہے؟ سچ پوچھیے تو میں اس مضمون پر زیادہ خیال ہی نہیں کرتی۔" شیلا نے جیسے خواب سے چونک کر کہا۔ پھر معلوم ہوتا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ شاید اسکے جواب سے روکھا پن ظاہر ہوا ہے۔ اس نے اس کے اثر کو مٹانے کی کوشش کی۔

"میں تو اسی موسم میں پیدا ہوئی۔ اسی میں اتنی بڑی ہوئی۔ اس وجہ سے میرے اوپر آج کے ایسے بُرے موسم کا زیادہ اثر نہیں ہوتا لیکن آپ لوگ جو مشرقی دھوپ کے عادی ہیں ضرور ہمارے تاریک انگریزی موسم کو گالیاں دیتے ہوں گے۔"

عارف کو ایسا جواب ملنے کی امید نہیں تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس کا پہلا وار ناکام رہا، اسے چند لمحوں تک سوچنے کی ضرورت پڑی۔ اب کیا کہنا چاہیے؟ اس نے اپنے دل میں سوال کیا۔

"تاریک موسم! بالکل ٹھیک کہا آپ نے کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ دن کو بھی مجھے کمرے میں روشنی جلانا ہوتی ہے۔" کریمہ نے اپنی گلابی ساری کا آنچل ٹھیک کیا اور چڑیا کی طرح چوں چوں کرنے لگی۔ "خیال تو کیجیے کل بارہ بجے دن کو مجھے اپنے کمرے میں کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اور اخباروں میں آپ نے دیکھا کیا خبر تھی؟ ہیمپسٹڈ کے پاس ایک عورت کے ہاتھ سے دن دھاڑے کسی نے ہینڈ بیگ چھین لیا اور بھاگ گیا۔ پولیس سے کچھ بنائے نہ بنی۔ یہ تو میں نے آج سنا ہے کہ آج کل وہاں خون تک ہو جاتے ہیں۔ اندھیرے میں چور ڈاکو اکیلی

عورتوں پر حملے کرتے ہیں اور ان کی لاشیں پیڑوں کے نیچے چھپا کر، چھپ ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ سال سنا ہے وہاں ایک لڑکی کی لاش ٹکڑے ٹکڑے کی ہوئی پائی گئی۔ سوا اس کے سر کے جو چھ مہینے بعد ایک بکس میں بند برائٹن کے اسٹیشن میں ملا۔ اور یہاں کی پولیس کو سنتے تھے بڑی چالاک ہے۔ کیا چالاکی اس نے دکھائی؟ ابھی تک قاتل کا پتہ نہیں چلا۔ میں تو ہیمپسٹڈ شام کے وقت کبھی اکیلی نہیں جاتی۔ کیا معلوم....." میں میں میں، ایک خشک سی ہنسی وہ ہنسیں۔

نعیم کو گھبراہٹ پھر شروع ہو گئی۔ اس کی باتیں سن کر شیلا اپنے دل میں کیا کہتی ہو گی۔ چرچر بولتی چلی جاتی ہے کمبخت، مہمل خرافات۔

"لیکن مس کریمہ" اس نے شرارت سے کہا۔ "ہیمپسٹڈ میں نوجوان عورتوں پر حملہ کی وجہ ہمیشہ چوری کرنا ہی نہیں ہوتی۔" نعیم کو یقین تھا کہ اب کریمہ ضرور اس مضمون پر گفتگو کا سلسلہ ختم کر دے گی۔

لیکن اسے مایوسی ہوئی۔

"پھر آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" بیگم صاحبہ نے ایک بچے کے بھولے پن سے پوچھا۔

نعیم ذرا جھجکا۔ پھر اس نے بڑی متانت سے کوشش کرتے ہوئے گہری آواز میں جواب دیا۔

"ایک مرد عورت پر اس کے زر و جواہر کے لئے حملہ کر کے اپنی زندگی کبھی خطرے میں نہیں ڈالتا۔ عورت کی دولت اس کے روپے پیسے نہیں۔ عورت کی دولت اسکی جوانی ہے عورت کی دولت اس کا حسن ہے اور جو بھوکا، پیاسا، مردانِ قیمتی چیزوں کو جو ہماری موجودہ سوسائٹی میں اس قدر بیکار ضائع ہوتی ہیں، اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر لوٹنے کی کوشش کرتا ہے اس

profakbar.blogspot.com

کے لئے قانون اپنی زنجیریں تیار کرے تو کرے، لیکن کسی اہل دل کی انگشت ملامت تو اس کی طرف ہرگز نہیں اٹھنی چاہیئے۔ میرے خیال میں جو لوگ ہیمپسٹیڈ میں نوجوان عورتوں پر حملے کرتے ہیں، ہمارے دل میں ان کی عزت ہونا چاہیئے!"

کریمہ بیگم کا چہرہ شرم کی وجہ سے سرخ ہو گیا اور ان کی آنکھیں نیچی ہو گئیں، معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی اپنی عصمت پر کسی بدمعاش نے حملہ کیا۔

عارف نے محسوس کیا کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی، اس نے چھت کی طرف دیکھ کر سگریٹ پینا شروع کر دیا۔

نسیم کی نظر شیلا پر پڑی۔ وہ مسکرا رہی تھی، اسے خوشی ہوئی کہ شیلا یہ سمجھ گئی کہ وہ یہ باتیں صرف شرارت کے لئے کر رہا ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس بے موقع اور غیر مہذب تقریر سے جو بے لطفی پیدا ہو گئی تھی اس کی تلخی کا احساس میاں عارف کو سب سے زیادہ تھا۔

"نسیم صاحب گراموفون بجائیے۔ آپ نے موریس شوالیئے[1] کی تازہ ترین فلم دیکھی؟ اس نے اس فلم میں لاجواب گانا گایا ہے۔ آپ کے پاس اس کا ریکارڈ تو ضرور ہوگا۔ میں نے گزشتہ ہفتہ چند ریکارڈ خریدے اس میں وہ بھی تھا" اور پھر شیلا کی طرف مڑ کر انہوں نے پوچھا۔ "آپ کو موریس شوالیئے پسند ہے؟"

"شروع شروع میں اس کی فلموں سے مجھے کافی دلچسپی تھی۔ اس میں ایک تازگی، ایک فرانسیسی لوچ تھا، لیکن اب اس کے گانے اور اس کی فلم دونوں میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔

[1] ایک مشہور فرانسیسی ایکٹر۔

میرے خیال میں اچھے اور برے آرٹسٹ کی پہچان یہ ہے کہ آرٹسٹ سے کبھی جی نہیں بھرتا جب اسے دیکھو تو ہر مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں نئے نئے روحانی تحفے پیش کرتا ہے۔ معمولی آرٹسٹ کا خزانہ بہت جلد خالی ہو جاتا ہے۔ اور ہم اس کے پاس سے اکثر خالی ہاتھ واپس آتے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟" شیلا نے عارف سے پوچھا۔

عارف اس سوال سے کچھ سٹپٹا گیا: "آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں، موریس شوالیئے کچھ اعلیٰ قسم کا ایکٹر نہیں ہے میں بھی اس سے عاجز ہو چلا ہوں۔ آپ کا کہنا بالکل بجا ہے۔ اس کا خزانہ اب بالکل خالی ہو گیا" اور یہ کہہ کر وہ ہنسا۔

"عارف!" نسیم نے اپنے دل میں سوچا: "ابھی ابھی تو موریس شوالیئے کی تعریف کر رہا تھا اور اب بے سوچے سمجھے اس کی برائی کرنے لگا۔ اور اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟"

مگر شیلا نے ان باتوں کی طرف توجہ نہیں کی اور اس نے عارف سے پوچھا: "آپ کے یہاں ہندوستان میں آرٹ کا کیا حال ہے؟ مجھے یقین ہے کہ ہندوستانی جو اتنے خوبصورت ہوتے ہیں، ضرور بہت اچھے آرٹسٹ بھی ہوں گے۔"

اب تو عارف اور گھبرایا۔ آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان کی تیاری میں لگے رہنے کی وجہ سے اسے اس کی بالکل فرصت نہیں ملی تھی کہ وہ فنون لطیفہ کی طرف توجہ کرے۔ دو برس سے وہ کولھو کے بیل کی طرح اس مشکل امتحان کی تیاری میں مشغول تھا۔ آٹھ آٹھ گھنٹے روزانہ بلاناغہ کام کرتا تھا۔ پھر بھلا اپنے دماغ کی تربیت کے لئے اس کو وقت کہاں سے ملتا۔ ہندوستان میں اس کا یہی حال تھا۔ اس کے خاندان والوں نے اس کے بچپن ہی سے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر آئی۔ سی۔ ایس میں شامل ہوگا۔ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اس کے کان میں یہی بات پڑتی تھی کہ وہ آئی۔ سی۔ ایس کے عہدہ پر پہنچنے والا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کو اور اس کے

profakbar.blogspot.com

رشتہ داروں کو اس بات کا یقین ہونے لگا کہ وہ ضرور اس مشکل امتحان میں کامیاب ہو گا وہ سمجھنے لگا کہ ان کے خاندان کا اور عارف کا پیدائشی حق ہے۔ ایک ہندوستانی شریف خاندان کے نوجوان کا اس سے بڑھ کر اور کیا حوصلہ ہو سکتا ہے کہ وہ مجسٹریٹی اور کلکٹری کے شاندار عہدہ تک پہنچ کر ہندوستان کے حاکموں میں شمار کیا جانے لگے گا۔ عارف نے بی۔اے پاس کرنے کے بعد ہندوستان میں آئی۔سی۔ایس کا امتحان دیا مگر وہ اس میں ناکامیاب رہا۔ اس ناکامیابی کی وجہ عارف اور اس کے خاندان والوں کے نزدیک یہ تھی کہ ایک ہندو ممتحن نے اُسے مسلمان ہونے کی وجہ سے نمبر کم دیئے۔ ورنہ کیسے ممکن تھا کہ عارف آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں پاس نہ ہو! ہندوستان میں فیل ہونے کے بعد عارف کے والد نے یہ طے کیا کہ انگلستان میں پاس ہونے کی امید زیادہ ہے۔ اب عارف ولایت بھیجا گیا۔ ولایت پہنچ کر اس نے پوری دیانتداری کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ شاید ہی کبھی وہ سینما یا تھیٹر میں جاتا ہو۔ دوسرے ہندوستانی طالب علم لڑکیوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے، ناچ گھروں میں جاتے، کھیل کود میں وقت گنواتے، پالٹکس میں حصہ لیتے، مگر عارف لیلائے سول سروس کا مجنوں تھا۔ خچر کی طرح سے وہ ایک سیدھے راستے پر لگا ہوا کام کرتا چلا جاتا۔ اس کے ساتھ اس کے ذہن میں یہ بات بھی سما گئی تھی کہ انگریزی کپڑے اچھی طرح پہننا، انگریزی زبان بالکل انگریزی لہجہ میں بولنا، سینما کی تصویروں کے بارے میں اور ہولی وڈ کے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے ذاتی معاملات، ان کی شادیوں اور طلاقوں کی تازہ ترین خبروں سے واقف رہنا اور ان پر بات چیت کرنا، کلکٹری کے امیدوار کا فرض ہے۔ وہ ان لوگوں کا جانشین ہونے والا تھا۔ جن کو اس بات پر فخر تھا کہ انہیں اپنی مادری زبان اچھی طرح بولنی نہیں آتی۔ اور جو اپنے کو انگریزوں سے بھی بڑھ کر "پکا صاحب" سمجھتے تھے۔ انہیں "بچے صاحب لوگوں" میں ایک مسلمان "کلکٹر صاحب" تھے۔ جن کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ

انہوں نے بقر عید کے دن اپنے مسلمان منشی سے پوچھا "ول منشی! کیا آج تم لوگوں کا بڑا دن ہے؟" یہ حالت ایک نسل پہلے تھی۔ لیکن یہ خیال کرنا غلط ہے کہ اُن بچے صاحبوں کے وارثوں میں "صاحبیت" کم ہو گئی اور انسانیت آگئی۔

"آپ کے خیال میں ہم ہندوستانی عام طور سے خوب صورت ہوتے ہیں؟" عارف نے اُلٹے شیلا سے اس سوال کو پوچھ کر ہندوستانی آرٹ کے متعلق گفتگو کے ٹال دینے کی کوشش کی۔ "ہم ہندوستانی" اس نے اس لہجے سے کہا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے کو سارے ہندوستانیوں کے حسن کا ٹھیکیدار سمجھتا ہے۔

شیلا نے جواب دیا "جی ہاں میرے نزدیک ہندوستانی، ہم انگریزوں سے زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں لیکن ممکن ہے میرا خیال غلط ہو کیونکہ میں نے صرف گنتی کے ہندوستانی یورپ میں دیکھے ہیں۔"

کریم بیگم نے جو نعیم کی گستاخانہ باتیں سن کر سُکڑ کر رہ گئی تھیں پھر اپنے پر پھڑپھڑانے کی کوشش کی۔

"کیا آپ لندن میں بہت سے ہندوستانیوں سے واقف ہیں؟" انہوں نے شیلا سے مسکرا کر پوچھا۔

"بدتمیز" نعیم نے خیال کیا "یہ عورت کوئی بات بھی ٹھکانے کی نہیں کرتی! سوال کرتے وقت مسکراتی تو ہے۔ اس طرح جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں، مگر دل میں زہر بھرا ہوا ہے! اس سے کیا مطلب کہ شیلا کتنے ہندوستانیوں کو جانتی ہے۔ خود تو یہ حالت ہو گی کہ مرد کا خیال کرنے سے بیگم صاحبہ کے جسم میں جھرجھری آجاتی ہو گی۔ یہ اور بات ہے کہ مرد ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔"

protakbar.blogspot.com

"معلوم نہیں بہت سے آپ کا کیا مطلب ہے۔" شیلا نے جواب دیا پھر وہ ذرا دیر رُکی اور ہنس کر کہا "ذرا در واقف ہونے کے بھی مختلف معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت تو ہندوستانیوں کی صورت شکل سے بحث ہے اور اس کے لئے ان سے واقف ہونا ضروری نہیں۔"

"خوب جواب دیا" نعیم نے سوچا "ایسے ناشائستہ سوال کا اسی طرح منہ توڑ جواب دینا چاہیئے۔"

شیلا نے اپنی گفتگو کو جاری رکھا "مجھے ہندوستان اور ہندوستان کی ہر چیز سے بہت دلچسپی ہے۔ میرے ایک چچا ہندوستان میں نوکر تھے۔ مجھے یاد ہے جب وہ چھٹیوں میں گھر واپس آتے تو وہ میرے لئے ہندوستانی کھلونے لایا کرتے تھے۔ عجیب و غریب کپڑے کی بنی ہوئی گڑیاں رنگ برنگ کے چمکدار کپڑے پہنے ہوئے ان کے تاگے سے بنے ہوئے کالے بال، ان کی لمبی لمبی چوٹیاں، اُن کے چھوٹے چھوٹے منہ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور بھنوئیں، انہیں دیکھ کر میں بچپن میں ہندوستان کو ایک پرستان سمجھتی تھی۔ جہاں خوبصورت شہزادے اور حسین سانولی عورتیں زر و جواہر میں لدے ہوئے سنگ مرمر کے بڑے بڑے محلوں میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب میں بڑی ہوئی اور میں نے اسکول جانا شروع کیا اور وہاں میں نے تاریخ پڑھی تو میرے بچپن کے تصورات رفتہ رفتہ بدلنے لگے۔ سراج الدولہ اور بلیک ہول کے ہولناک قصے پڑھ پڑھ کر اور ہندوستانیوں اور کالے آدمیوں کی برائیاں سن سن کر میرے دل میں ہر سیاہ فام انسان کی طرف سے کچھ خوف سا بیٹھ گیا۔ باوجود اس کے وہ دلچسپی جو مجھے اس دور دراز نامعلوم ملک سے بچپن ہی سے تھی غائب نہیں ہوئی۔ جب کالج میں داخل ہوئی تو میں نے ہندوستانی طالب علموں سے ملنے کی خاص طور پر کوشش کی، گو کہ میرے والدین ہمیشہ مجھ سے تاکید کیا کرتے تھے کہ کالے لوگوں سے بچتی رہوں۔ بد قسمتی سے میری ان خاص کوشش کا بہت

مایوس کن نتیجہ نکلا۔ لوگوں کو میری جانب سے طرح طرح کی غلط فہمیاں ہونے لگیں۔ اب مجھے ان باتوں کا خیال کر کے ہنسی آتی ہے۔ میں اس زمانہ میں کتنی ناتجربہ کاری اور حماقت کی حرکتیں کیا کرتی تھی!" شیلا چپ ہو گئی۔ اس کے لبوں پر تبسم کا شائبہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے گزرے ہوئے دنوں پر ترس بھری نظریں ڈال رہی ہے۔ کریمہ بیگم کو اس انگریز لڑکی پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ اتنی دیر سے وہی ساری گفتگو اور تمام دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ نعیم اور عارف دونوں ہر بات اسی کمبخت انگریزن کو خوش کرنے کے لئے کرتے۔ عارف کلب سے اس کے ساتھ یہاں آیا، لیکن اس لڑکی کو دیکھتے ہی اس نے کریمہ کا وجود تک بھلا دیا۔ برابر اس کی کوشش کرنا، اور بار بار تن تن کر صرف اس لئے کہ وہ ان کے بڑھیا سوٹ اور بانکے جسم کی طرف توجہ کرے، کریمہ کے دل میں یہ حرکتیں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھیں۔ انہیں نعیم الدین پر اور تعجب آ رہا تھا۔ وہ کتنا خاموش، نیک، خوش سلیقہ انسان تھا اور آج اس سے ایک بھی سیدھی بات نہیں ہوتی۔ کریمہ کی ہر بات کا وہ ٹیڑھا جواب دیتا۔ اس کے ساتھ بدتمیزی سے برتاؤ کرتا اور شیلا کی طرف دزدیدہ نگاہیں اور تبسم۔ ان ہندوستانی لڑکوں کو آخر کیا ہو گیا؟ گورا چٹا رنگ دیکھ کر انہیں اپنے اوپر بالکل قابو نہیں رہتا۔ سوا سفید چمڑے کے اور اس فرنگن میں کیا ہے؟ کیا کیا بن کر باتیں کرتی ہے۔ دیدہ دلیری سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چست کپڑے صرف اس لئے پہنتے ہیں کہ مرد ان کے جسم کی بہار دیکھیں۔ بے شرم، بے غیرت، بے حیا۔ ایسی عورتوں میں اور زنانِ بازاری میں کیا فرق؟ چڑیل کی طرح بال بکھرے ہوئے، منہ پر پوڈر لگا ہوا لہنگے میں سے گز گز بھر کی ٹانگیں باہر نکلیں، جرابیں ریشمی، اتنی باریک کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر۔ کھڑی ہوں تو اکڑ کر چلیں تو سینہ تان کر، سگریٹ یہ پئیں، شراب یہ پئیں، ناچیں یہ، کون سے ہنر ہیں جو ان فرنگنوں میں نہیں۔ رہ گئی عصمت آبرو، اسے تو یہ ہتھیلی پر لئے پھرتی،

profakbar.blogspot.com

ہیں۔ آج اس مرد پر ڈورا ڈالا تو کل دوسرے کو پھانسنے کی فکر۔ سوائے مزے اڑانے کے اُن کی زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں! اور ہمارے ہندوستانی لڑکے ولایت آ کر ان کے جال میں ایسا پھنستے ہیں کہ ان کو دنیا و ما فیہا کی خبر نہیں رہتی۔ آخر ان کی سمجھ پر کیوں پتھر پڑ گئے ہیں؟ کوئی مجھے بتلائے کہ اس شیلا گرین میں کہاں کا حسن کوٹ کوٹ کر بھرا ہے جو یہ دونوں اس پر مرے جاتے ہیں۔ بڑی آئی ہے ہندوستان کی دوست بننے والی! صرف ان لڑکوں کی خوشامد کے لئے کہتی ہے کہ ہمیشہ سے اسے ہندوستان سے دلچسپی رہی ہے۔ شرابی، سور خور، کرسٹان، ہمیں اس دوستی کی حقیقت خوب معلوم ہے۔ کہتی ہے کہ ہندوستانی بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ جس میں ان لڑکوں کے سر پھر جائیں! اور چالاکی تو دیکھو کیسا میرے سوال کو پی گئی۔ جواب دیتی تو قلعی نہ کھل جاتی۔ معلوم نہیں کتنے ہندوستانیوں کو خراب کر چکی ہوگی۔ چلتر باز! لیکن آخر ان لڑکوں کی عقل پر کیوں پردے پڑ گئے ہیں؟ بہت پڑھی لکھی بھی تو معلوم نہیں ہوتی۔ سینہ سپاٹ پھیکا رنگ صورت پر پھٹکار برستی ہے۔ جسم مردوں کا ایسا، یہ عورت ہے یا پہلوان ایک بھی بات تو شریف نادیوں کی سی نہیں۔ نیچ خاندان کی ہوگی۔ کسی مزدور اٹھائی گیرے کی لڑکی۔ انگریز اسے پوچھتے نہ ہوں گے۔ ایسی ایسی کتنی لڑکیوں کو یہاں شوہر نہیں دستیاب ہوتے۔ سب جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں۔ چلتی ہوئی عورت ہے، کسی بھولے بھالے امیر ہندوستانی شریف زادے کو پھانس کر اس سے شادی کرنے کی فکر میں ہوگی۔ دل میں ضرور ہم لوگوں سے نفرت کرتی ہوگی، لیکن اپنے کو دولت کے لئے بیچ دے گی۔

کریمہ بیگم طیش اور غصہ سے کھولنے لگیں۔ ان کا دل یہ چاہ رہا تھا کہ شیلا گرین کے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر نوچیں اور اسے دھکا دے کر اس کمرے سے باہر نکال دیں وہ اس وقت اپنے آپ کو تمام ہندوستانی نسل کی عزت اور آبرو کی واحد امین سمجھ رہی تھیں۔

عارف کو بھی شیلا کی طرف سے مایوسی ہونے لگی۔ اس نے بار بار اس سنہرے بالوں والی پری زاد پر اثر ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس لڑکی نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ "عجیب لڑکی معلوم ہوتی ہے"۔

عارف نے خیال کیا۔ "زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتی۔ کبھی آرٹ کی بات کرتی ہے تو کبھی ہندوستانیوں کے حسن کی۔ اس کے نزدیک میرا اس کمرے میں ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ مغرور ہے اپنے کو بہت قابل سمجھتی ہے۔ ضرور یونیورسٹی میں طالب علم ہوگی۔ جو لڑکیاں یونیورسٹی تک پہنچ جاتی ہیں۔ وہ خود کو بڑا علامۂ دہر سمجھنے لگتی ہیں۔" لیکن اس نے شکست قبول کرنے سے انکار کیا۔ وہ جو آئی سی ایس کا امتحان پاس کر کے ہندوستان میں سینکڑوں ہزاروں انسانوں پر حکومت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، وہ جس کی ایک نظرِ خشمگیں سے غریب ہندوستانیوں کے دل لرز جائیں گے (عارف ابھی سے اس حاکمانہ طاقت کی شراب کے مزے لینے لگا) وہ ایک معمولی انگریز لڑکی کے ہاتھوں ہرگز ہار نہیں ماننے کا تھا۔ ابھی اس کو معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ ہندوستانیوں کی خوبصورتی کا ذکر آخر کیوں کیا اس نے؟ عارف کو اپنے سارے کارنامے یاد آ گئے۔ کیا وہ ہندوستان میں ہمیشہ محنتی اور ذہین مشہور نہیں تھا؟ یہ سچ ہے کہ ہندو لڑکے ہمیشہ امتحان میں اس سے بازی لے جاتے تھے لیکن غالباً ہندو پروفیسروں کے تعصب کی وجہ سے تھا جو ہندوؤں کو اول کرنے کے لئے ہمیشہ اسے نمبر کم دیتے۔ مسلمانوں میں ہمیشہ وہی فرسٹ رہتا۔ اور پھر مسلمان ہندوؤں کی طرح چوٹی چھت پر باندھ کر رات رات بھر پڑھتے بھی تو نہیں۔ ان کی طبیعت میں حکومت ہے اور اچھی طرح حکومت کرنے کے لئے امتحان میں اول آنا ضروری نہیں!" عارف کو افسوس ہوا کہ اس کا انتخاب آئی۔ سی ایس میں براہ راست نامزدگی سے کیوں نہیں ہو گیا۔ حق اسی کا تھا مگر چونکہ دوسرے مسلمان امیدوار کے خاندان کا گورنمنٹ کی نظروں میں رتبہ زیادہ تھا۔ اس لئے دوسرا آدمی اس کی

جگہ منتخب ہو گیا۔ اگر آج وہ آئی۔سی۔ایس ہوتا تو نعیم کو ضرور "مسٹر عارف۔آئی۔سی۔ایس" کہہ کر شیلا سے اس کا تعارف کرانا پڑتا۔ خیر اب نہیں تو ایک سال بعد سہی اس نے اپنے دانت جما کر عہد کر لئے۔ اس نے پکا منصوبہ باندھا کہ وہ ایک گھنٹہ روزانہ اور زیادہ کام کرے گا۔ اور جس طرح وہ گھنٹوں کی محنت کے بعد کتابوں کے صفحے کے صفحے زبانی رٹ لینے میں کامیاب ہوتا تھا۔ اسی طرح اس وقت اس نے پورا تہیہ کر لیا کہ شیلا گرین پر وہ اپنا اثر ڈال کر رہے گا۔

عارف نے کہا "مس گرین مجھے امید ہے کہ آپ نے اپنے تلخ تجربوں کی وجہ سے ہندوستان سے اپنی دلچسپی کم نہیں کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہندوستانی طالب علم جو یورپ آتے ہیں اکثر اپنے غیر مہذب ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کو یہاں کی شریف خواتین سے ٹھیک طرح سے بات چیت کرنے اور ملنے جلنے کا طریقہ بالکل نہیں آتا۔"

شیلا ہنسنے لگی اور اس نے کہا "میرے تلخ تجربے! مہربانی فرما کر ان کو اتنی زیادہ اہمیت نہ دیجئے۔ ہر ناتجربہ کار لڑکی کے لئے یہ تجربے ضروری ہیں بغیر ان کے عورتوں کو سمجھ نہیں آتی۔ میرے کہنے کا بالکل یہ مطلب نہیں تھا کہ میں ہندوستانی طالب علموں کو غیر مہذب سمجھتی ہوں۔ برخلاف اس کے جیسا میں نے کہا اس معاملہ میں میرا اپنا قصور تھا۔ اور برائے خدا! آپ میرا شمار شریف خواتین، لیڈیوں میں نہ کیجئے۔" اس نے بڑی لجاجت سے نعیم کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے پوچھا۔

"کیا دراصل میری صورت اتنی مکروہ ہے کہ آپ مجھے ایک "شریف خاتون" سمجھیں؟ مجھے امید ہے کم از کم آپ تو مجھے اتنی گئی گزری نہ خیال کریں گے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دوڑ کر آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور اپنے اوپر سے پیر تک نظر ڈالی "نہیں ہرگز نہیں! مجھ میں کوئی بات شریف زادیوں ایسی نہیں۔ میرے چہرہ میں کونسی بناوٹ ہے؟ کیا میری

آنکھیں جھوٹ بولتی ہیں؟ اور میرے ہاتھ، دیکھئے میرے ہاتھ ایسے تو نہیں جن کو دیکھ کر کسی کو یہ شبہ ہو سکے کہ یہ کسی بیکار، اپاہج کے ہاتھ ہیں۔ اور جب میں بولتی ہوں تو گویا ہر وقت خرافات بکتی ہوں، کبھی کبھی ضرور، لیکن ہر وقت تو نہیں۔ اور میری آواز ایسی تو نہیں جسے سن کر کوئی یہ سمجھے کہ مینا بول رہی ہے۔ میں بدصورت سہی، بدشکل سہی، مگر میں دھوکا تو نہیں، جھوٹ تو نہیں۔" اس کے چہرے پر بچوں کی سی متانت آ گئی۔

نعیم زور سے قہقہہ مار کر ہنسا اور شیلا کو چڑانے کے لئے اس نے کہا "مس گرین آپ لاکھ کوشش کریں مگر شرافت کا دھبہ آپ کے دامن سے نہیں چھوٹ سکتا یہ تو پیدائشی چیز ہے آپ کے سر پر شرافت کا بوجھ خود خدا نے اپنی امانت سمجھ کر لادا ہے۔ اور آپ اس قیمتی خزانہ کو لٹا دینا چاہتی ہیں، یہ ناممکن ہے۔ اس کی کوشش ہی فضول ہے۔"

شیلا بھی ہنسنے لگی۔

عارف کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے اسے ایک بارگی اپنی پستی کا احساس ہونا شروع ہوا "آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی مرتبہ کوشش کرنے کے بعد بھی اس نے ابھی تک ایک بات بھی ایسی نہیں کی جسے یہ لڑکی پسند کرے! اور نعیم بغیر زیادہ بولے ہوئے کتنی اچھی طرح اس لڑکی پر اثر ڈال رہا ہے۔ نعیم تو میری طرح خوبصورت ہے اور نہ ہی اس کے کپڑے اچھے ہیں۔ مجھے کامیابی کیوں نہیں ہوتی؟" وہ اسی فکر میں ڈوب گیا اور نعیم اور شیلا کو زور زور سے ہنستا دیکھ کر خود بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

کریمہ بیگم شیلا کو اس طرح ہنستا بولتا دیکھ کر جل بھن کر کباب ہوئی جا رہی تھیں۔

profakbar.blogspot.com

پانچواں باب

تھوڑی دیر بعد نعیم کے کمرے میں دس پندرہ آدمی جمع ہو گئے، پانچ چھ لڑکیاں اور آٹھ دس لڑکے، گراموفون بجنے لگا۔ میز اور کرسیاں لوگوں نے کھسکا کر کنارے رکھ دیں اور ناچ شروع ہو گیا۔ کچھ لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے، کسی کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا۔ کوئی صرف لیمونیڈ یا شربت پی رہا تھا۔ کسی نے صرف سگریٹ پر قناعت کی تھی۔ ہر تین چار منٹ کے بعد ایک ریکارڈ ختم ہو جانے پر باجہ بجنا رک جاتا تو شور و غل میں ذرا کمی ہو جاتی۔ ناچنے والے جوڑے ایک دوسرے سے جدا ہو کر منتشر ہو جاتے۔ کوئی بیٹھے ہوئے لوگوں کے پاس جا کر ان کی گفتگو میں شامل ہو جاتا۔ کوئی کھڑا رہ جاتا اور بات چیت کا سلسلہ جاری رکھتا۔ کوئی کسی لڑکی کو الگ گوشے میں لے جا کر اس سے راز و نیاز کی باتیں کرتا۔ ایک دو آدمی جو شراب زیادہ پی گئے تھے۔ چلا چلا کر باتیں کر رہے تھے۔

اعظم ایک کونے میں اکیلا چپ بیٹھا تھا۔ اس کی دوست جمیلہ کا ابھی تک پتہ نہیں تھا۔ اس ناچ، رنگ، شور، باجے اور لوگوں کی ہنسی سے اسے تکلیف ہو رہی تھی! افسردگی نے اسے اتنا زیادہ دبا لیا تھا، کہ وہ خود کو اس محفل میں اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ جیسے

بہتے ہوئے چشمے میں ایک بھاری پتھر۔

راؤ جو شیلا کے ساتھ ناچ رہا تھا ابھی رکا تھا۔ نعیم کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا، شیلا بھی وہیں آ گئی۔ وہ شیلا کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"نعیم اس سنہرے بالوں والی اینگلو انڈین لڑکی کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اتنی دیر جو یہ تمہارے ساتھ اکیلی رہی تو ضرور اس نے تم پر رعب جمانے کی کوشش کی ہو گی۔ اور تم سیدھے سادے آدمی رعب میں آ گئے ہو گے۔ لیکن میں ان صاحبزادی کی حقیقت خوب جانتا ہوں، فلسفہ پالٹکس، ہندوستان، وید، گاندھی، ٹیگور ہر چیز پر آپ رائے زنی کرنے کے لئے تیار رہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمہارا بھی سر کھا گئی ہوں گی۔"

"برخلاف اس کے" نعیم نے جواب دیا۔ "مس گرین سے مل کر اور ان کی باتیں سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ ہم زندگی کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ زندگی کے بارے میں مس گرین کے خیالات نہایت دلچسپ اور قابل غور ہیں۔"

راؤ قہقہہ مار کر ہنسا "زندگی! اور اس پر بحث! اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہو سکتی ہے۔ انسان اپنے کو کس قدر اہم، کس قدر عظیم الشان ہستی خیال کرتا ہے! لیکن نظام کائنات میں ہمارا کیا درجہ ہے؟ زمین پر رینگنے والے کیڑوں میں سے ذلیل ترین کیڑے کا۔ اور ہم اپنی زندگی کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جیسے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کائنات کے مرکز ہیں! یہ کتنی مضحک بات ہے!"

کریم بیگم بھی ایک طرف بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔

"لیکن بیگم صاحب" ان سے گفتگو کرنے والا لڑکا کہہ رہا تھا: "آپ کی کوشش بالکل بیکار ہے۔ آپ کہتی ہیں کہ ہمیں یورپ سے صرف یہاں کی اچھائیاں سیکھنا چاہئیں، برائیاں نہیں۔ اور آپ ہمارے سامنے ایک ایسا نصب العین پیش کرتی ہیں جس میں ہندوستانی

profakbar.blogspot.com

اپنی سب برائیاں چھوڑ کر اپنی اچھائیاں اور یورپ کی اچھائیاں ملا کر دُنیا کی بہترین مخلوق بن جائیں آپ کی اس بات پر دو اعتراض کئے جا سکتے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ ایک سوسائٹی میں اچھائیاں اور برائیاں انسانوں کی ذاتی رائے اور ذاتی پسند کی وجہ سے نہیں رائج ہوتیں۔ آپ یورپ کی بہت سی باتوں کو بُرا سمجھتی ہیں۔ مثلاً آپ کہتی ہیں کہ یہاں کی عورتوں کا آزادی کا معیار انہیں برے راستے پر لے جاتا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ یہ رسم اور رواج کیوں وجود میں آئے۔ یورپین زندگی میں نئے معیار کیوں قائم ہوئے۔ پانچ سو برس پہلے یہاں کی عورتوں کا قریب قریب وہی درجہ تھا جو ہندوستان میں آج کل ہے۔ لیکن اس درمیان میں یورپ کے معاشی نظام میں زبردست انقلاب ہو گیا۔ جس کا اثر یہاں کے سماجی اور سیاسی نظام پر بھی پڑا، اس وجہ سے یورپین ذہنیت میں بھی انقلاب واقع ہوا۔ یہاں کے رسم و رواج سب بدل گئے۔ آج کل کا یورپین انسان ان تمام تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔ اس کی اچھائیوں اور برائیوں کی جڑ اس کے سماجی نظام میں ہے۔ ہندوستان میں بھی بڑی بڑی بنیادی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جسے آپ یورپ کا ضرورت سے زیادہ اثر کہتی ہیں وہ انہیں تبدیلیوں کی وجہ سے بڑھ رہا ہے۔ ان میں اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ صرف ان کو دیکھنا اور ان کی جڑ پر نظر نہ ڈالنا حماقت ہے۔ اور دوسرا اعتراض.....۔"

ان دونوں کے ادھر ادھر ایک دو لڑکے لڑکیاں اور آ کر کھڑے ہو گئے۔ کسی نے بات کاٹ کر کہا۔ "دوسرا اعتراض جناب احسان پر میرا یہ ہے کہ انہیں کوئی حق یہاں اسپیچ دینے کا نہیں۔ ہم لوگ پارٹی میں شریک ہونے آئے ہیں لکچر سننے نہیں۔ اس لئے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ احسان اور کریمہ بیگم فوراً کھڑے ہو کر ساتھ ناچیں۔"

اس مجمع کا مرکز بن جانے کی وجہ سے کریمہ بیگم کے دل کو ذرا سکون ہوا۔ تین چار لڑکوں نے اصرار

کرنا شروع کیا کہ وہ احسان کے ساتھ ناچیں۔ احسان بھی ہنس کر کھڑا ہو گیا۔

"ضرور۔ میں تیار ہوں۔" اور کریمہ بیگم کے سامنے جھک کر اُس نے کہا: "کیا آپ میرے ساتھ ناچ کر مجھے شرف بخشیں گی؟"

کریمہ بیگم مسکرائیں۔ انہوں نے اپنی ساری کا آنچل ٹھیک کیا اور سر ٹیڑھا کر کے بولیں "میں مجبور ہوں مجھے ناچنا بالکل نہیں آتا۔" پھر یکایک انہیں خیال آیا کہ ناچنا کتنی بری اور ذلیل چیز ہے انہیں ہندوستانیوں خصوصاً مسلمان لڑکوں پر غصہ آیا جنہوں نے اس غیر ملک میں آ کر اپنی تہذیب، اپنے مذہب اور اپنی رسموں کو اس طرح بھلا دیا تھا کہ انہیں ایک مسلمان ہندوستانی لڑکی کے ناچنے کے خیال سے ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ انہوں نے طنزیہ لہجہ میں احسان سے کہا "معلوم ہوتا ہے آپ بھول گئے کہ ہمارے یہاں ناچنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔"

اتنے میں پھر باجا بجنے لگا۔ لوگ پھر ناچنے لگے۔ لیکن احسان کریمہ بیگم کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا "کیا یہ لڑکی دراصل سنجیدگی سے ان معاملات پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچی ہے۔ یا صرف تنگ نظر قدامت پسندی کی وجہ سے یوں باتیں کر رہی ہے؟ ہندوستان سے جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ شروع شروع میں اکثر اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں میں خود دو برس پہلے ناچنے کے خلاف تھا۔ لیکن اب..... اس کے خیالات شور و غل کے سبب منتشر ہو گئے۔ اس نے کریمہ بیگم سے کہا: "جی نہیں میں اس بات کو بالکل نہیں بھولا ہوں کہ ہمارے یہاں ناچنا برا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میں آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اچھائی اور برائی کا معیار کیا ہے؟ کون اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ فلاں رسم اچھی ہے اور فلاں رسم بُری ہے؟ یہی میرا دوسرا اعتراض

profakbar.blogspot.com

آپ پر ہے۔ آپ ہندوستان سے اکیلی اتنی دور کفرستان میں آئیں۔ آپ پردہ نہیں کرتیں آپ انگریزی زبان کی ماہر ہیں، آپ نے ساری، جو ہندوؤں کا لباس ہے زیب تن فرمایا ہے، آپ رات کے وقت غیر مردوں کی محفل میں بے تکلف تشریف فرما ہیں، آپ مجھ سے زور و شور کے ساتھ بحث کر رہی ہیں۔ کیا یہ باتیں ہمارے یہاں معیوب نہیں سمجھی جاتیں؟

"میں نے یہ کب کہا کہ ہماری ہر بات اچھی ہے اور یورپ کی ہر بات بُری ہے، میں تو صرف یہاں کی اندھا دھند تقلید کے خلاف ہوں" کریمہ بیگم نے جواب دیا۔

"اور میں صرف مغرب ہی نہیں بلکہ ہر چیز کی اندھی تقلید کے خلاف ہوں" احسان نے بلند آواز میں کہا "ہندوستان میں سینکڑوں برس تک زندہ عورتیں مردوں پر ستی ہو جاتی تھیں اس لئے کہ یہ ان کا مذہبی فریضہ تھا۔ ساری دنیا میں سینکڑوں برس تک اپنے سے کمزور انسانوں کو غلام بنانا اور بردہ فروشی قریب قریب ہر ملک میں رائج تھی اور کوئی اس کے خلاف کچھ نہیں کہتا تھا۔ لیکن آج ہم ان کو بُرا سمجھتے ہیں۔ کیوں؟ صرف یہی نہیں آپ یہ بھی دیکھیں گی کہ زندگی کے ہر اہم مسئلہ پر مختلف طبقہ کے لوگوں میں سخت اختلاف رائے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً آج کل ایک گروہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ لوگ جو اپنی دماغی یا جسمانی قوتوں کو کام میں لا کر سوسائٹی کو فائدہ نہیں پہنچاتے وہ قوم کے جسم پر بدنما اور زہریلے آبلوں کی طرح ہیں، جن کو کاٹ کر پھینک دینا چاہیئے۔ دوسرا گروہ دولت و ثروت کو موروثی ملک خیال کرتا ہے اور بے شرمی کے ساتھ دوسروں کی محنت کا پھل کھانا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ کون غلط ہے اور کون صحیح؟ کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟ آپ کس طرح اس کی تمیز کریں گی؟"

"یہ شخص تو میرا سر کھا جائیگا" کریمہ بیگم نے سوچنا شروع کیا "میں نے ایک بات

کیا کہہ دی کہ یہ ڈنڈا لے کر میرے پیچھے پڑ گیا۔ باتیں کرنا اسے خوب آتا ہے۔ باوجود اسکے ..." ان کے دل میں ان ہندوستانی طالب علموں کی طرف سے نفرت کم نہیں ہوئی جو پڑھنے لکھنے کے لئے یورپ آتے اور یہاں آکر ناچ رنگ میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ کیا ہمارے والدین نے اسی لئے انہیں ہزار میل دور بھیجا ہے؟ شاید اسی وجہ سے میرے والدین اس کے خلاف تھے کہ میں ولایت تعلیم کے لئے آؤں۔ لیکن میں اپنے زورِ بازو سے یہاں آئی۔ وظیفہ لے کر۔ میں ان لوگوں کی طرح نہیں جو اپنے والدین کی ساری بچی بچائی دولت پھونک دیتے ہیں اور یہاں سے بمشکل امتحان پاس کر کے برسوں کے بعد گھر واپس جاتے ہیں۔ اور سونے پر سہاگہ تو یہ ہے کہ اکثر اپنے ساتھ ایک میم صاحب بھی لے جاتے ہیں۔ ..... میں کیوں آج یہاں آئی؟ میں نے بالکل ٹھیک کیا تھا جو ہندوستانیوں سے لندن میں ملنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ احسان صاحب جو اس وقت بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہے ہیں، یہ بھی کوئی پارسا نہیں اس دن شیشم رسٹوران میں آپ ایک انگریز لڑکی کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر دوسری طرف منہ موڑ لیا جیسے پہچانا ہی نہیں۔ جب کھانا ختم کر کے باہر جانے لگے تو میز کے قریب سے گزرنا پڑا، انہیں مجبوراً مجھے سلام کرنا پڑا۔ لیکن میں نے بھی اس طرح جواب دیا گویا یاد کرتے ہوں گے ..."

"میں یہ سب کچھ نہیں جانتی" کریمہ بیگم نے جھنجھلا کر جواب دیا "لیکن مجھے شراب پینے اور انگریز ...... عورتوں کے پیچھے گلیوں گلیوں مارے مارے پھرنے میں تو مجھے اچھائی نظر نہیں آتی"۔

"اور میں نے آپ سے یہ کب کہا کہ میں ان حرکتوں کو ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا مدعا اور مقصد بنانا چاہتا ہوں؟" احسان کی آواز میں غصہ تھا۔

ایک طرف سے آواز آئی، شراب کے اثر سے لڑکھڑاتی ہوئی "لندن ل ل لندن"

نفرت ہے مجھے اس شہر سے۔ کوئی چیز تو یہاں پسند کی نہیں۔ پسند تم میں نے کہا۔ جانتے ہو آج کیا واقعہ ہوا۔ میں آج دوپہر کو ریجنٹ پیلس گیا۔ ارادہ تھا کہ لڑکی پکڑوں، لڑکی ......"

"ارے یار خاں اتنے زور زور سے باتیں مت کرو۔ یہاں عورتیں بھی ہیں سنیں گی تو کیا کہیں گی"، کسی نے التجا کی۔

"ایسی تیسی عورتوں کی۔ میرے اٹھ سے۔ میرا کیا بگاڑ لیں گی عورتیں۔ بس سنو میرا قصہ! دو عورتیں میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک تو بڑھیا سی تھی مگر دوسری ذرا مزیدار تھی، جوان، بار بار میری طرف دیکھتی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ مجھے مخاطب کرنا چاہتی ہے۔ لیکن میں نے اپنے دل میں کہا کہ جوان تو ٹھیک ہے مگر بڑھیا کمبخت کو کیا کروں گا۔"

"کتنی بڑھیا تھی، اب ایسی بھی کیا ہو گی۔ لائے ہوتے یار دونوں کو کسی اور کا فائدہ ہو جاتا۔" بات کاٹ کر ایک صاحب بولے۔

"بیچ میں مت بولو" خاں نے بگڑ کر کہا۔ "میں نے بھی اس نوجوان لڑکی کے ساتھ نظر بازی شروع کر دی، تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی ...."

"یار کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ یہ رعب کسی اور پر جمانا۔ بڑی شان کی لیا کرتے تھے، ابھی اس دن میرے ساتھ تم جب ریجنٹ پیلس گئے تو کسی عورت نے تمہارے اوپر نظر تک نہیں ڈالی۔ بگڑا تو در کنار۔ ایسے آپ حسین نہیں ہیں کہ صورت دیکھ کر آپ پر عورتیں فریفتہ ہو جائیں۔"

"شنگھ! کہتا ہوں کہ بیچ میں مت بولو۔ ورنہ اچھی بات نہیں ہو گی۔" خاں صاحب نے بگڑ کر کہا۔

"اچھا خیر! آپ بڑے حسین سہی۔ بتاؤ تو ہوا کیا؟" شنگھ ہنس کر بولا۔

"پھر میں نے ان سے بات چیت شروع کر دی۔ یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔ اگر شنگھ میری جگہ پر ہوتے تو دیکھتا ایک حرف ان کے منہ سے نہ نکلتا۔ جانتے ہو میں نے کس طرح گفتگو شروع کی؟" خاں صاحب نے اکڑ کر پوچھا۔

"معلوم ہے مجھے" سنگھ نے کہا۔ "آپ نے بڑی شان کے ساتھ واسکٹ کی جیب سے سونے کا سگرٹ کیس نکال کر ان غریب عورتوں کو عبداللہ سگرٹ پیش کئے ہوں گے۔"

"غلط غلط بالکل غلط" خاں نے جھوم کر کہا۔ "میری نظر اس جوان لڑکی کی انگلیوں پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک انگوٹھی پہنے ہوئے ہے۔ میں نے فوراً کہا 'کس قدر عمدہ زمرد ہے! اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ایک سیکنڈ کے لئے مجھے اس بیش بہا نگینہ پر نظر ڈالنے دیجئے۔ ہم مشرقی لوگ ان چیزوں کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔' بس یہ کافی تھا۔ سمجھ گئی کہ میں کوئی ایسا ویسا ٹٹ پونجیا طالب علم نہیں ہوں۔ بلکہ رئیس ہوں جو اس طرح سے ہیرے جواہرات پرکھ رہا ہوں۔ سن لیجئے جناب شنگھ صاحب میں رئیس ہوں۔ میں یورپ اس لئے نہیں آیا ہوں کہ اسکول کے لونڈوں کی طرح صبح سے شام تک امتحان پاس کرنے کی فکر میں لگا رہوں۔ جتنے دن جی چاہے یہاں ٹھہروں اور جب جی چاہے یہاں سے واپس جا سکتا ہوں۔ ... واپس۔"

راؤ بھی خاں صاحب کے قریب کھڑا ہو کر ان کی باتیں سن رہا تھا اس نے کہا "آپ تکلف کیوں فرما رہے ہیں کہہ دیجئے نہ صاف صاف کہ آپ پرنس ہیں شہزادے ہیں یورپ آ کر تو چھوٹے سے چھوٹا ہندوستانی زمیندار اپنے کو شہزادہ سمجھنے لگتا ہے اور یہاں کی بھولی بھالی عورتوں پر رعب ڈالنے کے لئے اپنے نام کے آگے "پرنس" لگا لیتا ہے۔

profakhar.blogspot.com

"کیا میرے رئیس ہونے میں کسی کو شک ہے؟" خاں صاحب نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"میں رئیس، میرا باپ رئیس، میرا پردادا رئیس، پشتہا پشت سے ہم رئیس چلے آتے ہیں۔ میرے مورثِ اعلیٰ کو اکبر بادشاہ نے پنج ہزاری کا عہدہ دیا تھا۔ وہ بخارا سے سیدھے دہلی آئے تھے اور وہاں پہنچ کر اکبر بادشاہ کے دربار میں ان کا بہت بڑا رتبہ ہوا۔"

"تو یہ کون بڑے فخر کی بات ہے۔ اکبر کے گھوڑوں کی لید صاف کرتے رہے ہوں گے۔ تم ۔ نسل دیکھنا ہو تو مجھے دیکھو! چندر بنسی راجپوت ہوں۔ چاند کی اولاد۔ کبھی دشمن کے سامنے سر نہیں نیچا کیا۔" سنگھ نے کہا۔

"اور اب پنج ہزاری سردار کے صاحبزادے اور راجپوت سورما دونوں بڑے فخر سے انگریزوں کے بوٹ کی نوک چاٹتے ہیں۔" راؤ بولا۔

"اور تم کیا کرتے ہو؟" خان اور سنگھ دونوں نے ایک ساتھ بگڑ کر کہا۔

"میں تو بیرسٹری کر رہا ہوں، تمہارے ایسے رئیسوں کی حماقتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے۔" راؤ نے ہنس کر جواب دیا۔

"تم سب کے سب رئیس بنتے ہو، جن بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، سرکاری نوکر جونک کی طرح ہو اور ہندستان کے مزدوروں اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔ ایسی حالت قیامت تک قائم نہیں رہے گی۔ کسی نہ کسی دن تو ہندستان کے لاکھوں کروڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے چونکیں گے بس اسی دن تم سب کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔" احسان نے اپنے کرخت پنجابی لہجے میں کہا۔

"یہ بالشویک یہاں کہاں سے آگیا۔" خاں صاحب نے جھنجلا کر پوچھا۔

"جناب احسان صاحب آپ خود کیا کرتے ہیں جو اوروں پر اس طرح اعتراض کر رہے ہیں؟

آپ کے پاس جو ہر مہینہ گھر سے بیس پاؤنڈ آتے ہیں وہ آپ کے والد کے پاس آسمان سے تو نہیں ٹپکتے! جہاں تک مجھے علم ہے وہ بھی سرکاری ملازم ہیں، اُن کو جو تنخواہ ملتی ہے وہ آپ ہی کے قول کے مطابق ہندستانی مزدوروں اور کسانوں کا خون ہے۔ آپ یہاں ہندستان کے غریب لوگوں کی کونسی خدمت کر رہے ہیں؟ دوسرے ہندستانی طالب علموں کی طرح آپ بھی ڈگری لینے کے بعد نوکری کی کوشش کریں گے۔ تو پھر ہم پر اعتراض کرنے سے کیا فائدہ؟" سنگھ نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

احسان جواب دینے نہ پایا تھا کہ راؤ بول اُٹھا۔

"مجھے احسان سے اتفاق ہے۔ ہماری حیثیت کسی طرح چوروں اور ڈاکوؤں سے بہتر نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہندستان کی دولت جو ہم یہاں لٹا رہے ہیں۔ ہم کو اس کا حق ہے؟ ہماری زندگی سے ہندستان کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ خاک پتھر لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ جب تک اس دنیا میں اتنے بے وقوف لوگ موجود ہیں جو ہم ایسے بیکاروں کو اسی بات کا موقع دیتے ہیں کہ دن دہاڑے ان کی جیب کتریں، جب تک ہندستان کے محنت مزدوری کرنے والوں کو جوتا کھانے میں مزا آتا ہے اس وقت تک ان بھیڑیوں کے گلوں کے لئے فکر کھپانا اور ان کی بھلائی کی کوشش کرنا محض تضیع اوقات ہے ہم لوگ جو خوش قسمت ہیں اور جن کے قبضے میں تھوڑی بہت دولت لوٹ کھسوٹ کر آگئی ہے، ان کو چاہیئے کہ وہ بے فکری کے ساتھ خوب مزے اڑائیں۔ خدا معلوم کل کو کیا ہو گا۔"

"ارے یارو!" خان صاحب نے چلا کر کہا۔ "پالیٹکس کی باتیں ختم کرو۔ جہاں جاؤ سالی پالیٹکس دُم کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ اُن سے تو نجات ملنی مشکل ہو گئی۔ بڑے آئے ہیں۔ بالشویک بننے والے! ہندستان کو بالشوزم سے کوئی تعلق نہیں۔ سنتے ہیں کہ روس میں عورتیں

profakbar.blogspot.com

قوی ہیکل ہو گئیں۔ حبش کا حبشی جا پہنچے حبش عورت کے ساتھ ......"

احسان جو کھڑا ہوا تھا خاں صاحب کی طرف مڑا اور ان کے کندھے پر ایک ہاتھ رکھ کر اس نے آہستہ آہستہ کہا: "بس یہی سنا آپ نے روس کے بارے میں؟ ایک خبر اور سن لیجئے میں سناتا ہوں، انقلاب کے پہلے آپ کی طرح کے جانور روس میں پائے جاتے تھے بالشویکوں نے ان کو اپنے کھیتوں کی کھاد بنا ڈالا۔"

چھ فٹ لمبے، لحیم شحیم پنجابی نوجوان نے بچارے خاں صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس طرح سے جو باتیں کیں تو ڈر کے مارے ان کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ نازک بدن، دبلے پتلے، رئیس زادے تھے اپنی کرسی پر دبک کر رہ گئے۔ اور کھسیانے پن سے ہنس کر بولے: "یار تم خفا ہو گئے! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم روس کے بارے میں ایسی ہی سنی سنائی کہتا تھا۔"

احسان جواب دیئے بغیر دوسری طرف مڑ کر کسی اور سے مخاطب ہو گیا۔

"ہلو ایوری باڈی۔" دروازے کے پاس سے ایک نووارد لڑکی نے چلا کر کہا۔ لوگ ناچ رہے تھے۔ ایک دو آدمیوں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر ناچ میں مشغول ہو گئے۔

لیکن اعظم کا دل دھڑکنے لگا۔ کیونکہ یہ جبین کی آواز تھی۔ دو تین گھنٹے دیر کر کے آخر کار وہ آ ہی گئی۔ لیکن یہ انتظار کس قدر تکلیف دہ کتنا ناقابل برداشت تھا۔ اور اب جب اس کی آواز اعظم کے کانوں میں پڑی تو وہ تکلیف ایک ہیجان کی کیفیت سے بدل گئی۔ انتظار کے وقت اس کی حالت ایسی کمان کی طرح تھی جسے ایک زور آور شخص برابر کھینچتا چلا جاتا ہو، اور وہ اتنی تن جائے کہ اس سے زیادہ کھنچنا ناممکن ہو۔ اور اب

اعظم کے جذبات اس طرح لرزاں تھے جیسے اس انتہا تک تنی ہوئی کمان سے تیر مارنے کے فوراً بعد اس کا تانت تھرتھراتا ہو۔

اعظم اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح جبین سے ملے۔ لیکن جبین کی نظروں نے چاروں طرف دیکھ کر ڈھونڈھ نکالا وہ لپک کر اسی کے پاس گئی اور اعظم کے چہرہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف اٹھایا۔ اعظم چپ رہا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ جبین کی موجودگی کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس کے دل کو سکون ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن صرف اس کے دل کی اوپری سطح کا یہ حال تھا۔ اس سطح کے نیچے حسد کا طوفان برپا تھا۔ محبت کی روشنی اس کے دل کے تاریک محشرستان میں چراغ کے لرزاں شعلہ کی طرح کمزور ہو کر بالکل غائب ہو جانے کے قریب تھی۔

"پلیز، پلیز، اتنے تو مجھ سے خفا مت ہو۔" جبین نے مسکرا کر کہا۔ "کیا مجھ سے بالکل بات چیت بند کر دو گے؟ میں نے بہت کوشش کی وقت پر آنے کی۔ لیکن کیا کروں کامیابی نہیں ہوئی۔ قصور میرا نہیں۔"

"تو کیا میرا قصور ہے!" اعظم نے اپنے دل میں کہا۔ پھر وہ زور سے بولا: "جبین تم تین گھنٹے دیر کر کے آئی ہو ایک گھنٹے کے قریب میں نے رسل اسکوائر پر تمہارا انتظار کیا۔ اگر تم نے پہلے سے کہہ دیا ہوتا کہ وقت پر نہ آ سکو گی تو مجھے انتظار نہ کرنا پڑتا۔" یہ کہنے کے بعد اسے اس بات پر تعجب ہوا کہ اس نے اتنے نرم لہجے میں جبین سے بات کی۔

جبین نے اعظم کے گال پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لئے اور اس کے سامنے قصوروار بچے کی طرح گردن جھکا کر کھڑی ہو گئی اور کن انکھیوں سے اعظم کی طرف کبھی کبھی دیکھ

pdfbookspar.blogspot.com

لیتی۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔

"لیکن ڈارلنگ، میں تو پہلے آنا چاہتی تھی۔ عین وقت پر کام میں پھنس گئی کیا کروں مجھے اپنے کپڑوں پر استری کرنا تھی، اس کے بعد ——— اس کے بعد میرے بھائی کے دو دوست آگئے اور زبردستی بھائی کے ساتھ مجھے سینما گھسیٹ لے گئے۔ میں لاکھ کہتی رہی مگر انہوں نے ایک نہ مانی۔ بہت اچھی فلم تھی ورنہ آج اس کا آخری دن تھا اگر اب نہ جاتی تو پھر وہ تماشا بالکل دیکھنے ہی میں نہ آتا۔"

"سینما جانا اور کپڑوں پر استری کرنا آپ کے نزدیک اتنا ضروری ہے کہ میرے تین گھنٹے بیکار ضائع کئے جائیں! تمہیں شرم نہیں آتی یہ کہتے ہوئے کہ تم ضروری کام کی وجہ سے نہیں آسکتی تھیں!" اعظم نے جھلا کر کہا۔ اسے ایک عجیب قسم کی افسردہ خوشی اس بات سے ہو رہی تھی کہ آخر کار جو کچھ اس کے دل میں تھا وہی اس کی زبان سے نکلا۔ اسی طرح غصہ میں آکر اس نے کبھی جین سے باتیں نہیں کی تھیں۔ اس کے فوراً ہی بعد اسے سخت رنج کا احساس ہوا۔ کیا یہ وہی لڑکی ہے جسے دیکھ کر دو برس پہلے میں اپنے قابو سے باہر ہو گیا تھا؟ یہ دو برس کس طرح گزرے کبھی خوشی، کبھی رنج، کبھی پریشانی اور اب یہ وقت آ پہنچا کہ میں غصہ میں اس سے باتیں کر رہا ہوں اور اس کی باتوں سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے یہ ہے میری معشوقہ۔ اس لڑکی سے مجھے عشق ہے عشق؟ محبت؟ کیا میں دو برس سے اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں؟ خوفناک خیال!" اتنے میں اعظم کے کانوں میں خاں صاحب کے بولنے کی آواز آئی "یار یہ کون چھوکری ہے۔ جو اعظم سے باتیں کر رہی ہے۔ غضب کی گرم معلوم ہوتی ہے۔ یار مجھے بہت پسند ....."

"تم سے اتنی دفعہ کہہ دیا چلا کر مت باتیں کرو..... یہ لڑکی اعظم کی معشوقہ ہے اگر

اس نے تمہاری باتیں سن لیں تو تمہارا سر توڑ دے گا" شنگو نے کہا۔

اعظم کو خاں صاحب کی بدتمیزی پر غصہ آیا۔ اس کا خیال بٹ گیا۔ جین نے اس کے گلے میں دونوں ہاتھ ڈال دیئے اور اس کی گود میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا "مجھے معاف کر دو"۔ اور یہ کہہ کر، قبل اس کے کہ اعظم کچھ جواب دے اس کے لبوں کا بوسہ لے لیا۔

اسی وقت راؤ ان کے پاس سے گزرا اور اس نے ہنس کر کہا "ہائیں یہاں اس کی اجازت نہیں!"

جین ایک دم اعظم کی گود سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ راؤ نے اس سے ہاتھ ملا کر کہا "خوب آپ نے ہم لوگوں کو سردی میں ایک گھنٹہ رسل اسکوائر پر کھڑا رکھا!"

"مجھے بہت افسوس ہے" جین نے کہا "مسٹر راؤ آپ اعظم سے میری سفارش کر دیجئے۔ مجھ سے اتنے خفا ہیں کہ بات تک نہیں کرتے"

"اے اعظم" راؤ نے کہا "احمق مت بن۔ جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ اٹھو اور جین کے ساتھ ناچو"

"ہاں۔ آؤ" جین نے کہا اور اعظم کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹ کر کرسی سے اٹھایا۔

گراموفون بج رہا تھا اور اس سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔

عشق ہمیں زندہ کرتا ہے،
عشق ہمیں بچا لیتا ہے،
عشق ہمیں خوش کرتا ہے،

protakbar.blogspot.com

عشق ہمیں غمگین کرتا ہے،
عشق! عجیب و غریب عشق!
جین اور عظم ساتھ ساتھ ناچنے لگے۔

عارف گھر جانے کی فکر میں تھا۔ اس کی شام ساری ضائع گئی۔ ساری شام! خیال تو کرو اتنی دیر میں کتنا کام ہو سکتا تھا۔ زبانی امتحان میں طرح طرح کے بے ڈھنگے سوال پوچھے جاتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اخبار پڑھتا رہے۔ اسی وجہ سے عارف ہر روز "ٹائمز" وظیفہ کی طرح پڑھتا تھا اور کبھی کبھی اس میں سے اچھے اچھے جملے ایک علیحدہ کاپی پر نقل بھی کر لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ ان جملوں کو زبانی یاد کرنے کی کوشش کرتا۔ اکثر دوستوں کے ساتھ گفتگو میں وہ اس طرح کی باتیں کرتا تھا جس کے دوران میں یہ چنے ہوئے جملے استعمال کر سکے۔ ..... اسے امید تھی کہ اس طرح سے رفتہ رفتہ نہ صرف اس کی انگریزی زبان کی مہارت بہتر ہو جائے گی۔ بلکہ "ٹائمز" اخبار کے خیالات اس کے دماغ میں اچھی طرح سے جم جائیں گے۔ اس اخبار کا نقطۂ نظر انگلستان کے "بڑے صاحبوں" کا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ جو بات "ٹائمز" میں چھپ جائے اسے "سرکاری" سمجھنا چاہیئے۔ عارف چاہتا تھا کہ وہ سرکاری خیالات میں بالکل ڈوب جائے اور جب امتحان کا وقت آئے تو اس کے قلم سے اور اس کی زبان سے ایک حرف بھی ایسا نہ نکلے جس سے امپیریلسٹ ممتحنوں کو کسی قسم کا اختلاف ہو سکے۔ اوروں کی رائے کو اپنا بناتے بناتے اس کا دماغ گراموفون کی طرح ہو گیا تھا۔ لیکن اسے اس بات کا احساس بالکل نہیں تھا۔ جھوٹے نقلی سکے استعمال کرنے کی اس کو اتنی عادت ہو گئی تھی کہ وہ

انہیں سچا سمجھنے لگا تھا۔ اور کیوں اس کی ذہنیت ایسی نہ ہوتی؟ اس کے خاندان میں رات رات اس بات کی دعائیں مانگی جاتی تھیں کہ کسی طرح سے وہ آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں کامیاب ہو۔ ہندوستان میں یونیورسٹی کے طالب علموں میں اکثر کا منصوبہ یہی ہوتا ہے کہ وہ سرکاری نوکری کریں۔ اس کے اکثر دوست کسی نہ کسی قسم کے امتحان کی تیاری میں لگے رہتے تھے۔ انگلستان میں بھی زیادہ تر ہندستانی طالب علم اسی زمرہ میں گنے جا سکتے ہیں تھوڑے سے جو اس زمرہ سے باہر تھے عارف ان سے ہمیشہ دور رہتا۔ صرف ایک نعیم الدین ایسا شخص تھا۔ جس کے یہاں عارف دوسرے تیسرے مہینے آجایا کرتا تھا اور اس کی بھی یہ وجہ تھی کہ نعیم اس کا دور کا رشتے دار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ہندستانی طالب علموں کی یونین میں کبھی کبھار چلا جاتا۔ ہندستانی "کری" اور چاول کھانے کے لئے۔ لیکن وہ ہمیشہ دیکھ بھال کر ایسے ہی طالب علموں کے ساتھ میز پر بیٹھتا تھا جو اس کی طرح کسی سرکاری امتحان کی تیاری کرتے ہوتے۔ اسے وہ واقعہ یاد تھا جب جگہ نہ ہونے کی وجہ سے اسے ایک دفعہ احسان اور راؤ کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا پڑا۔ اور احسان نے اس سے سخت بے تکے سوال پوچھنا شروع کئے۔ اور طنز و طعن کی وجہ سے چین سے کھانا مشکل کر دیا۔ احسان نے اس سے پوچھا "عارف صاحب۔ اگر آپ کسی ضلع میں مجسٹریٹ ہوئے اور ہم لوگوں نے وہاں سیاسی شورش شروع کی تو آپ ہمیں جیل خانے بھیجیں گے یا نہیں؟ آپ ہمارے جلوسوں پر گولی چلانے کا حکم دیں گے یا نہیں؟"

اور اس نے پریشان ہو کر جواب دیا تھا "ڈیوٹی از ڈیوٹی" لیکن آپ یہ کیوں فرض کرتے ہیں کہ میں بے قصور لوگوں کو قید کر دوں گا۔ اور بے جرموں پر گولیاں چلواؤں گا؟"

profakhar.blogspot.com

اس جواب پر احسان زور سے قہقہہ مار کر ہنسا تھا اور اُس نے کہا تھا: "تو یہ کہئے آپ نے ابھی سے غیر ملکی انگریزی حکومت کی "ڈیوٹی" کو اپنی "ڈیوٹی" تسلیم کر لیا ہے اور اس کے بجالانے کے لئے بالکل تیار ہیں!"

"تو اور کیا کریں؟" راؤ نے کہا تھا: "سرکار کا حکم بجالانے کے فائدے ظاہر ہیں، دولت، طاقت، اور تھوڑی بہت غریب نیٹوز پر حکومت۔ تم ایسے پاگلوں کا ساتھ دینے میں ذرہ برابر بھی فائدہ نہیں۔ اُلٹے نقصان ہی ہے۔ پہلے تو کوئی توجہ ہی نہیں کرتا۔ آپ لاکھ آزادی آزادی چلایا کیجئے۔ اگر ہیبت گلا پھاڑا، آسمان سر پہ اٹھایا، تو جیل خانے کی ہوا کھایئے۔ بیوی بچے بھوک سے مریں، دو تین برس بعد جب قید سے نکلے تو وہاں کی ریت ملی ہوئی روٹیاں کھاتے کھاتے صحت ایسی لاجواب ہو جاتی ہے کہ کیا کہنا، بس اس کے بعد صرف ایک راستہ کھلا رہ جاتا ہے! عبادت کا، گھر میں بیٹھ کر خدا کو یاد کیجئے۔ اور تھوڑے دنوں بعد دوسری دنیا کو سدھاریئے۔ جب دوسرا راستہ اس منزل پر پہنچاتا ہو تو پھر" عارف نے کیا تصور کیا۔ "اگر انگریزی راستہ پکڑا؟"

"ٹھیک ٹھیک! بالکل ٹھیک" احسان نے کہا: "اکبر کہہ گیا ہے نا:۔

کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا!

مشکل صرف یہ ہے کہ اب تو ڈبل روٹی اور کلرکی بھی نہیں ملتی۔ اس لئے ہم شریف نوجوانوں میں اکثر کو بھوکوں کی پلٹن میں شامل ہونا پڑتا ہے۔"

اسی طرح گفتگو کا سلسلہ جاری رہا آخر کار عارف جلدی جلدی کھانا کھا کر اس میز سے اٹھ گیا۔ خدا خدا کر کے اسے ان آزاد خیال طالب علموں سے نجات ملی تھی۔ اس کے دل میں اس قسم کے طالب علموں کی طرف سے ایک قسم کی نفرت

ہی تھی۔

"یہ ہم لوگوں سے حسد کرتے ہیں" عارف کا خیال تھا: "وہی نوکریاں جن کا یہ مذاق اڑاتے ہیں اگر ان کو مل جائیں تو خود بڑی خوشی سے قبول کر لیں گے اور پھر تمام نیشنلزم اور بالشوزم ہمیشہ کے لئے بھلا دیں گے۔ اصل میں یہ لوگ محنت سے بھاگتے ہیں! جانتے ہیں کہ کبھی ان سے مشکل امتحان پاس نہ کئے جائیں گے اس لئے لندن میں بیٹھ کر خوب پالیٹکس بگھارتے ہیں اور گورنمنٹ کو گالیاں دیتے ہیں۔ ہندستان پہنچ کر ساری شیخی نکل جاتی ہے۔ جس مجسٹریٹ کا یہاں مذاق اڑاتے ہیں اسی کو سلام کرنے روز اس کے بنگلے پر پہنچتے ہیں اور اُس کے اردلی تک کی ڈانٹ سنتے ہیں۔"

عارف نے دیکھا کہ راؤ اور احسان ایک کونے میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ اسے اس بات سے خوشی ہوئی کہ وہ دونوں اس کے پاس نہیں۔ عارف نہیں چاہتا تھا کہ ان لوگوں کے حلقہ میں پھنسے۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ کمرے میں جو لڑکیاں تھیں ان پر اس نے نظر ڈالی۔ اسے بیساختہ خواہش ہوئی کہ کسی لڑکی سے وہ بھی ملے۔ اس کے ساتھ ناچے اور پھر اس کی صحبت کا لطف اٹھائے، جو شکست اس کو ہوئی تھی وہ ابھی تک اس کے دل میں کھٹک رہی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اگر وہاں کوئی لڑکی اس کے ساتھ جانے پر راضی نہ ہوئی تو وہ پکاڈلی کے قریب گلیوں میں سے کسی سڑک پر ٹہلنے والی رنڈی کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔

کمرے میں سگریٹ کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ روشنی بھی کچھ زیادہ تیز نہیں تھی۔ آتشدان میں انگارے دہک رہے تھے، ان میں سے شعلے نکلنا بند ہو گئے تھے۔ سیاہ پردوں کے پیچھے کوئی لڑکا معلوم ہوتا تھا کسی لڑکی کو پیار کر رہا ہے، لڑکی کی دبی ہوئی ہنسی کی آواز

protakbar.blogspot.com

موسیقی کی چیخ، گفتگو، قہقہہ، ناچتے ہوئے جوڑوں کا بار بار گھومنا، یہ سب چیزیں عارف کی طبیعت میں ایک ہیجان پیدا کر رہی تھیں۔

وہ ایک سیاہ بالوں والی موٹی لڑکی کے پاس گیا اور مسکرا کر اُس سے پوچھا۔

"کیا اب کی بار آپ میرے ساتھ ناچیں گی؟"

لڑکی عارف کی طرف مڑی اور اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ "ضرور۔"

عارف اس کے ساتھ ناچنے لگا۔ اسے اس لڑکی کی شخصیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تو صرف یہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک نرم و نازک جسم اس کے دل و دماغ کو گرمی پہنچا رہا ہے۔

راؤ نعیم الدین کو الگ لے جا کر اس سے باتیں کر رہا تھا۔

"ارے نعیم! تمہیں کیا ہو گیا؟ میں نے آج تک تمہیں کسی کے لئے سرگرداں نہیں پایا۔ لیکن آج تم شیلا کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ کئی گھنٹے سے تم اسی کے گرد منڈلا رہے ہو۔ کم سے کم تمہیں یہ تو خیال کرنا چاہیئے کہ میں نے اسے یہاں مدعو کیا ہے اور وہ میری دوست ہے! یا تو آپ کسی لڑکی پر نظر ہی نہیں ڈالتے تھے یا آپ کی طبیعت کسی عورت کی طرف مائل بھی ہوئی تو ایک دوست کی چیز پر ڈورے ڈالنے لگے؟"

نعیم ہنسا "درجنوں لڑکیاں تمہاری دوست ہیں اگر ایک کم ہو گئی تو تمہیں معلوم بھی نہیں ہوگا۔ لیکن سچ بتاؤ کیا شیلا سے تمہیں واقعی دلچسپی ہے۔" راؤ کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ شیلا بول اٹھی۔

"یہ میرے خلاف آپ دونوں کیا سازش کر رہے ہیں؟" شیلا کی ہنستی ہوئی آواز ذرا دور سے آئی۔ اس نے نعیم اور راؤ کی باتوں میں اپنا نام شاید سن لیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی

اور راؤ اور نعیم کے بیچ میں کھڑی ہو گئی

"تمہارے خلاف سازش! بھلا کس کی مجال ہے۔" راؤ نے کہا۔ "اس وقت تو بحث یہ تھی کہ تم سے عشق کیا جا سکتا ہے یا نہیں!"

نعیم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسے راؤ پر کچھ غصہ سا آیا۔ اس نے سوچا کہ شیلا اپنے دل میں اسے کتنا احمق خیال کرتی ہو گی۔

"یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے۔" شیلا نے مسکرا کر کہا۔ "اور آپ لوگ کس نتیجے پر پہنچے؟"

"وہی جو میں تم سے ہمیشہ سے کہتا چلا آیا ہوں۔ کہ تم عشق کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتی ہو جنسی تعلقات کے علاوہ اس میں کچھ بھی نہیں اور باقی جو کچھ محبت کے بارے میں لوگ کہتے ہیں، وہ سب اصلیت کو چھپانے کے لئے شاعری کے پردے ہیں۔ چونکہ ہم ہندوستانیوں میں تم مغرب کے وحشیوں کے مقابلے میں روحانیت زیادہ ہوتی ہے اس لئے ہم ہر چیز کی اصلیت کو تم سے بہتر سمجھتے ہیں اور حقیقت کے راستے پر تم سے زیادہ آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرد اور عورت کے باہمی تعلقات کی تہ تک پہنچ کر ہماری سوسائٹی نے اس کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ہم نے اپنے گھروں سے عشق و محبت کو کوڑے کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ جیسے کابک کے خانوں میں بند کر کے کبوتروں کے جوڑے لگائے جاتے ہیں اسی طرح ہمارے یہاں نر اور مادہ انسان بڑے دھوم دھڑکے کے ساتھ ایک کوٹھڑی میں بند کر دیئے جاتے ہیں اس رسم کو ہم "شادی" کہتے ہیں۔ ضرور کسی دل لگی باز نے یہ نام رکھا ہو گا۔ مس شیلا گرین آپ بہت سے ہندوستانیوں سے ملیں مگر معلوم ہوتا ہے آپ پر ہماری روحانی تہذیب

pdfarkbar.blogspot.com

کا ذرا بھی اثر نہیں پڑا۔"

شیلا ہنسنے لگی۔ نعیم بھی مسکرا رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ راؤ کے اس بے تکلفی سے باتیں کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، کیا وہ شیلا پر عاشق ہے، نہیں اگر ایسا ہوتا تو اس نے مجھ سے ضرور اس بات کا ذکر کیا ہوتا۔ شاید راؤ اور اس لڑکی کا کالج میں ساتھ رہا ہو اور وہیں ان دونوں کی دوستی ہو گئی ہو اچھا ہوا کہ راؤ اس قسم کی باتیں شیلا سے کر رہا تھا۔ اگرچہ نعیم خود کسی لڑکی سے اس طرح کھلی ہوئی باتیں کبھی نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ چونکہ وہ اس گفتگو میں شامل تھا اس لئے وہ بھی شیلا کے ساتھ اب بے تکلفی کا برتاؤ کر سکے گا۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ان ضرورت سے زیادہ "مہذب" عورتوں میں نہیں تھی جن کے ساتھ دل کھول کر باتیں کرتے ہوئے اس وجہ سے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی لفظ ایسا نہ استعمال ہو جائے۔ جسے وہ ناشائستہ خیال کریں۔

شیلا نے ہنس کر کہا "اور تم اس روحانی تہذیب کے کتنے اچھے نمونے ہو! میں تو ضرور تمہاری روحانیت کا شکار ہو جاتی اگر تمہارا جسمانی حسن اتنے غضب کا نہ ہوتا تمہارے ساتھ کوٹھڑی میں بند ہونے کو دل ہی نہیں چاہتا، تمہیں دیکھ کر تو سمندر کے پجاریوں کی طرح سر بسجود ہونے کی خواہش ہوتی ہے۔"

راؤ بھی ہنسنے لگا "اب میں خودکشی کر لوں گا۔" اس نے کہا "میری باتوں کا تم پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ ہر مرتبہ جب میں تم سے اظہارِ عشق کرتا ہوں، تم کوئی نیا عذر، کوئی نئی بات نکال کر مجھے ٹال دیتی ہو۔ مشرق کی روحانیت مغرب کی مادیت، میرا حسن، اپنی جوانی کسی چیز کا بھی تو آپ خیال نہیں کرتیں۔ شیلا گرین! میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے

میں جاتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

وہ شیلا کے سامنے جھکا اور پھر مڑ کر تنتا ہوا، کمرے کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔ جیسے سپاہی مورچہ پر شہید ہونے کے لئے جاتا ہو۔ اور وہاں جا کر وہ دوسرے لوگوں سے ہنسی مذاق کرنے لگا۔ شیلا اور نعیم اپنی جگہ پر اکیلے کھڑے رہ گئے۔

مجھے راؤ پسند ہے۔" شیلا نے نعیم سے کہا "میں کئی برس سے اس سے واقف ہوں لیکن اس شخص میں میں نے کبھی کوئی تبدیلی نہیں پائی۔ اس سے باتیں کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں کسی چیز کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ خصوصاً وہ چیزیں جنہیں عام انسان عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جو کوئی راؤ کو اچھی طرح نہیں جانتا وہ اس سے پہلی بار مل کر ضرور یہی سمجھتا ہوگا کہ اس شخص کا دل پتھر کا ہے، نہ تو اسے کسی چیز سے انس ہے اور نہ کسی چیز کا لحاظ۔ لیکن دراصل ایسا نہیں۔"

"میرا بھی وہ بہت عزیز دوست ہے" نعیم نے کہا "اور میرے جاننے والوں میں وہ سب سے زیادہ ذہین طالب علم ہے۔ لیکن کبھی کبھی مجھے اس کی ذہانت بیکار اور بے فیض سی معلوم ہوتی ہے۔ آسانی سے امتحان پاس کر لینا اور مزیدار باتیں کرنا ہمارے لئے کافی نہیں مجھے جب کبھی اس بات کا خیال آتا ہے کہ راؤ یہاں سے واپس جا کر ہندستان میں کیا کرے گا۔ تو میری سمجھ میں اس سوال کا کچھ جواب نہیں آتا۔ اکثر ہندستانی طالب علموں کے بارے میں مجھے یہ فکر نہیں ہوتی، دنیا میں ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ لیکن راؤ جو اپنی ذہانت کی وجہ سے ہر بات کو فوراً سمجھ لیتا ہے، ہر بات کی تہ تک ایک منٹ میں پہنچ جاتا ہے وہ بھی اگر اسی گروہ میں گم ہو جائے تو مجھے رنج ہوگا۔"

prodarbar.blogspot.com

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو نعیم۔ ہندستانی طالب علم اتنی بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے ہیں کہ زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر باتونی میں نے اور کسی قوم کو نہیں پایا۔ وہ گھنٹوں تک مسلسل اصل مضمون کو چھوڑ کر ذرا ذرا سے نکتوں پر بحث کرتے چلے جاتے ہیں۔ مذاق کرتے ہیں تو ایک دوسرے کی دھجیاں اڑا دیتے ہیں۔ اور چلاتے اس قدر ہیں کہ معلوم ہوتا ہے آپس میں مارپیٹ ہو جائے گی۔ جب کبھی میں ہندستانی طالب علموں سے ملتی ہوں تو میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ جن کو باتوں میں اس قدر انہماک معلوم ہوتا ہے اور جن کی نظروں میں اس قدر کشش ہے۔ کیا اُن کی زندگی بھی جوش و خروش سے بھری ہوئی ہوگی؟" وہ رک گئی، نعیم بھی کچھ نہیں بولا تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد شیلا نے آہستہ سے کہا "کم از کم ایک ہندستانی کو تو میں جانتی ہوں جس کے بارے میں اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔"

نعیم نے بیساختہ سوال کیا: "کون؟ اس کا کیا نام ہے؟"

"تم اسے نہ جانتے ہو گے۔ میں کئی برس ہوئے اس سے سوئٹزرلینڈ میں ملی تھی ....." پھر اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا "نعیم کیا تم ناچتے نہیں؟ میں اتنی دیر سے تمہارے یہاں ہوں تم نے ایک بار بھی مجھے ناچنے کی دعوت نہیں دی۔ واہ! آپ اچھے میزبان ہیں!"

نعیم فوراً سمجھ گیا کہ شیلا صرف بات ٹالنے کے لئے یہ کہہ رہی ہے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں غمگینی جھلک رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کمرے میں قید ہے، ہر چیز اور ہر شخص اس وقت اس پر بار ہو رہا ہے۔ خود اپنی آواز جیسے اسے کھوکھلی، بے رنگ معلوم ہو رہی ہے۔ اس نے نعیم کی طرف یوں دیکھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی

زبان سے التجا کئے بغیر اس کی "مدد" اس کی ہمدردی کی خواستگار ہے۔ کیوں؟ کیوں؟ نعیم نے اپنے دل سے سوال کیا اور یہ سوال بندوق کی گولی کی طرح دل و دماغ کے پار ہو گیا۔

"مجھے ناچنا اچھی طرح نہیں آتا" نعیم نے کہا۔ "تمہیں میرے ساتھ ناچنے میں بالکل لطف نہیں آئیگا۔ لیکن اگر تم اپنے پیروں کے کچل جانے کی پرواہ نہ کرو تو میں بخوشی تمہارے ساتھ ناچوں گا۔"

"اگر اس کا مجھے ڈر ہوتا تو مجھے آج تک ناچنا نہ آتا" شیلا نے ہنس کر کہا۔

شیلا اور نعیم نے ناچنا شروع کیا۔ ان کے پاؤں موسیقی کی تال کے ساتھ ساتھ اٹھ رہے تھے، لیکن ان میں ایک قسم کی آہستگی، ایک قسم کا بھاری پن تھا۔

نعیم کا منہ اور اس کی ناک شیلا کے بالوں سے کبھی کبھی چھو جاتے تھے۔ شیلا کا داہنا ہاتھ نعیم کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ نعیم نے محسوس کیا کہ شیلا کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہے۔ اس نے اس کے ہاتھ کو زور سے دبایا۔

نعیم کے دل میں ایک طوفان برپا تھا۔ اس بے خودی کے عالم میں کبھی کبھی ایک دھندلا سا خیال اس کے دماغ میں آتا اور پھر غائب ہو جاتا۔

"نعیم نعیم کیا تمہیں اس لڑکی سے محبت ہو گئی؟"

"محبت کا نام کیوں بدنام کر رہے ہو! تم سمجھتے بھی ہو محبت کیا ہے۔ تم پر بے خودی سی چھائی جا رہی ہے۔"

"نعیم تمہارا دل محبت کے لئے بنا ہے۔ جس طرح شہد کے چھتے میں شہد بھرا

profakbar.blogspot.com

ہوتا ہے۔"

"تمہیں جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ بدنصیب! تمہیں ابھی تک یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ تم اس لائق نہیں۔"

"پھر میں کیا کروں، برائے خدا مجھے بتاؤ۔ کیا اس کربلا میں پیاس بجھانے کی بالکل اجازت نہیں۔؟"

"تم پیاسے ہی نہیں۔ تمہارا دل بیکاری کی وجہ سے اب کسی کام کا نہیں رہا۔ تم ان مسافروں سے بھی بدتر ہو جو تھک کر راستے میں گر پڑیں یا جو واپس جانے پر آمادہ ہیں۔ تم چلے ہی نہیں۔"

آہ! لیکن اس کے لب! ان کی حلاوت، ان کی نرمی، ان کی حرارت آمیز تری، اس کی پلکیں جو بار بار اتنی خاموشی سے اٹھتی ہیں، اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وہ دو باریک تیر چمکتے ہوئے نقطے جو ادھر سے ادھر ہوتے رہتے ہیں! اس کا سارا جسم۔ یہ سب میرے ہیں، انہیں میرا ہونا چاہیئے۔"

"اس دنیا میں آج تک کوئی چیز مفت ملی ہے؟ تمہارے پاس کیا ہے؟"

"تو کیا میری نجات کی کوئی صورت نہیں؟ خوشی کے سب دروازے میرے لئے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے؟"

جب تک ناچ ہوتا رہا شیلا اور نعیم پر کامل سکوت چھایا رہا۔ باجے کے ایک بارگی رک جانے سے وہ جیسے ایک خواب سے چونک اٹھے۔ وہ بھی رک گئے اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے کے ایک گوشے کی طرف بڑھے۔ اور وہاں

پہنچ کر نعیم نے بہت آہستہ سے اتنی دھیمی آواز میں جو مشکل سے سنائی دیتی صرف ایک لفظ کہا "شیلا" اور اس کے ہاتھوں کو چوم لیا۔

شیلا نے بھی بہت آہستہ سے کہا "نعیم" اور اس کے ہاتھ کو ذرا سا دبا کر چھوڑ دیا۔

profakbar.blogspot.com

چھٹا باب

رات کا کوئی ایک بجا ہوگا کہ نعیم الدین کے کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ سب کی نظریں اس کی طرف مڑ گئیں۔ یہ مالکہ مکان تھی، بڑھیا عورت دبلی، لمبے قد کی، اس کے بال سفید تھے اور وہ سیاہ کپڑے پہنے ہوئی تھی۔

"مسٹر نعیم" اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ "میں آپ سے ایک منٹ کے لئے علیحدہ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

نعیم نے باجہ روک دیا۔ کمرے کا شور و غل بھی کم ہو گیا۔ ہر شخص کے چہرے سے اس نووارد بڑھیا کے اس طرح سے ان کے عیش و عشرت میں خلل انداز ہونے کی وجہ سے جھنجھلاہٹ اور غصہ معلوم ہوتا تھا۔

نعیم نے بحیثیت میزبان ہونے کے اس بے لطفی کو محسوس کیا اور اس نے پکار کر کہا "سب لوگ بدستور بات چیت ناچنا جاری رکھیں، میں ابھی واپس آتا ہوں" اور یہ کہہ کر وہ دروازہ کی طرف بڑھا جہاں اس کی لینڈ لیڈی کھڑی ہوئی تھی۔

"یہ شیطان کی خالہ کون ہے؟ یہاں کس لئے گھس آئی" خان صاحب نے چلا کر کہا

"چلاؤ مت خان، لینڈ لیڈی ہے۔ گھر سے نکال دے گی تو ساری شیخی رکھی رہ جائے گی" سنگھ نے خان صاحب سے ڈانٹ کر کہا۔ لیکن وہ اتنی پی گئے کہ اپنے ہوش میں نہیں تھے۔

"مجھے کوئی شالا یہاں سے نکال نہیں سکتا۔" انہوں نے جھوم کر کہا۔ انگریزی میں گالی دے کر۔

اتنے میں کسی نے کمرے میں اچھی طرح روشنی کر دی اور لینڈ لیڈی نے ناک اونچی کر کے سارے گروہ پر نظر ڈالی۔ کوئی فرش پر لیٹا ہوا خراٹے لے رہا تھا، کوئی آگ کے قریب اپنی معشوقہ کی کمر میں ہاتھ ڈالے بیٹھا ہوا تھا، کوئی پردوں کی آڑ میں چھپا کھڑا تھا، کوئی ادھر تھا، کوئی ادھر خان صاحب کی طرف بڑھیا نے گھور کر دیکھا اور فوراً دروازہ کھول کر واپس چلی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ نعیم بھی باہر گیا۔

"بس دم نکل گیا نا! بڑھیا نے ایک نظر ڈالی کہ آپ کی بولتی بند ہو گئی" سنگھ نے خان کو چڑانے کے لئے کہا۔

خان صاحب غصہ میں آ کر کھڑے ہو گئے اور کمرے کے بیچ و بیچ میں لڑکھڑاتے ہوئے پہنچے۔ اور ان نے جھوم جھوم کر، چاروں طرف ہاتھ ہلا ہلا کر کہا۔ "سنگھ صاحب فرماتے ہیں کہ میں ڈر کے مارے چپ ہو گیا۔ یہ جھوٹ ہے، بالکل جھوٹ کوئی مجھ کو چپ نہیں کرا سکتا میں چیلنج کرتا ہوں۔ سب کو اس مجمع میں۔ میں یہاں کھڑا ہو کر باتیں کرنا شروع کرتا ہوں کوئی گھڑی لے کر بیٹھ جائے اور جتنی دیر تک میں بولتا جاؤں اسے نوٹ کر لے۔ اگر کوئی صاحب مجھ سے زیادہ دیر تک بولیں تو میں ان کو ایک پاؤنڈ دوں گا۔ اور اگر میں جیتوں گا تو وہ مجھے یہی رقم دیں۔"

جتنے لڑکے اور لڑکیاں کمرے میں تھے وہ سب یہ سن کر ہنسنے لگے۔ لوگ لینڈ لیڈی کی

profakbar.blogspot.com

کے آنے کو بھول گئے اور سب نے خان صاحب کی باتیں سن کر تالی بجانا شروع کی۔

راؤ نے پکار کر کہا "ہے کوئی خان کے چیلنج کو قبول کرنے والا؟ سنگھ تم خان کو چھیڑتے رہتے ہو۔ اب تمہیں کو چاہیئے کہ ان کی شرط قبول کرو۔"

"اچھی بات ہے" سنگھ نے کہا۔ "بشرطیکہ خان صاحب پہلے بولنا شروع کریں اور جب تک تھک نہ جائیں اور کسی وجہ سے بولنا نہ روکیں۔"

"بالکل ٹھیک۔ خان صاحب آپ کا چیلنج قبول ہو گیا۔ شروع کیجئے۔ اس وقت ایک بج کر ساڑھے بارہ منٹ آئے ہیں۔ آپ تیار ہیں؟ ایک ..... دو ..... تین ..... اسٹارٹ!" راؤ گھڑی لے کر خان کے پاس کھڑا ہو گیا۔

لوگ چاروں طرف سے جمع ہو کر خان کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

"ایک تو ذرا اچھی تھی، مگر دوسری کمبخت بڑھیا کھوسٹ ....." خان صاحب نے اپنی داستان شروع کی۔

"ارے واہ یہ قصہ تو تم بیان کر چکے ہو۔ اب کچھ اور کہو" کسی نے کہا۔

خان صاحب نے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بات سنی ہی نہیں۔ انہوں نے اپنی کہانی جاری رکھی۔ مجبوری تھی، سخت مجبوری، آخر کار دونوں کو مجھے کھانا کھلانا پڑا۔ اب میں سمجھا کہ بڑھیا سے تو کم از کم نجات ملے گی۔ لیکن یار وہ کھسکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ دوسری سے بھی باتیں کرنا مشکل ہو گئیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ ...." "کس رستوران میں کھانا کھلایا تھا؟" سنگھ نے آہستہ سے پوچھ ہی لیا۔

خان صاحب بولتے بولتے رک گئے۔ ایک بارگی وہ غصہ میں سنگھ کی طرف مڑے اور انہوں نے چلا کر کہا "شرط گئی ایسی تیسی میں۔ واللہ اگر میں آج سے تم سے بات تک

کروں تو میں پٹھان کا نہیں، چمار کا نطفہ ہوں! تم کیا سمجھتے ہو۔ میرے پاس دو لڑکیوں کو کھانا کھلانے کے پیسے نہیں جو ایسے سوال کرتے ہو! بڑے آئے ہیں پوچھنے والے۔ "کس رستوران میں کھلایا تھا" تمہارے مطلب؟"

"خان صاحب خفا ہونے کی شرط نہیں۔ یوں تو آپ رئیس ہیں، ایک پاؤنڈ کیا دس پاؤنڈ آپ کے لئے کیا چیز ہیں۔ دینا چاہتے ہوں تو چپ ہو جائیے۔ آپ کو اختیار ہے۔"

"چپ ہونے والے پر لعنت" خان صاحب کڑک کر بولے، لیکن اب ان کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ ان سے کھڑا ہونا مشکل تھا۔ ان کے ہوش و حواس بالکل درست نہیں تھے انہوں نے چلا چلا کر گانا شروع کیا عجیب بھی پھٹی سی بھیانک آواز میں

"کافر ہے جو سجدہ آکرے بت خانہ سمجھ کر   سر رکھ دیا آ ہم نے در جانانہ سمجھ کر

در جانانہ سمجھ کر ہے در جانانہ ......"

اور کہتے کہتے وہ دھڑ سے فرش پر گر پڑے، لوگ زور سے قہقہہ مار کر ہنسے لیکن خان صاحب نیچے پڑے پڑے "کافر ہے، اسے کافر ہے ....." کے نعرے لگاتے رہے۔

اتنے میں کسی نے گراموفون چلا دیا، ہنسی، چیخ، زور زور سے گفتگو، ناچ، سگریٹ کا دھواں۔ ایک دو آدمی کونے میں بیٹھے ہوئے، خاموش، جو ان سب چیزوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے، اس لڑکی کے پریشان بال، اس کی متوحش آنکھیں، اس لڑکے کی آواز میں لجاجت اس کی باتوں میں غصہ، محفل میں وہ شروع کی سی شگفتگی باقی نہیں رہی تھی، رات اب زیادہ گزر گئی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص خوش ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

نعیم الدین کمرے میں واپس آیا اور اس نے فوراً گراموفون بند کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کہا "میری لینڈ لیڈی کہتی ہے کہ شور بالکل نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ کل مجھے اس

profakbar.blogspot.com

گھر کو چھوڑ دینا پڑے گا۔"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اب اپنے اپنے گھر کا راستہ لینا چاہیئے۔" راؤ نے کہا۔

"تم تو میرے قریب ہی رہتے ہو نا، آؤ چلیں ساتھ چلیں گے۔"

"کیا میں آپ کو اپنی موٹر میں گھر پہنچا سکتا ہوں۔"

"ضرور، شکریہ" کی آوازیں آنے لگیں۔

اور نعیم شیلا کے پاس آیا۔ وہ بھی اپنا کوٹ پہن رہی تھی۔

"آپ بھی جا رہی ہیں۔" اس نے کہا۔

شیلا نے مڑ کر نعیم کی طرف دیکھا۔ مگر اس کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔

"تھوڑی دیر تو اور ٹھہریئے۔" نعیم نے پھر کہا۔

"بہت اچھا۔" اس نے جواب دیا اور کھڑکی کے پاس جا کر اکیلی کھڑی ہو گئی۔

نعیم اپنے مہمانوں کو رخصت کرنے میں مشغول ہو گیا۔

(۲)

عارف اور وہ لڑکی جس کے ساتھ وہ ناچ رہا تھا، ایک ساتھ گھر سے نکلے۔ کہرہ غائب ہو گیا تھا اور بجلی کی روشنیاں جاڑے کی ٹھنڈی ہوا میں تیزی سے چمک رہی تھیں سڑک کے کنارے درخت، جن کی شاخیں پتیوں سے بالکل خالی تھیں، چپ کھڑے ہوئے تھے۔

عارف کو سردی معلوم ہوئی۔ اسے ڈر لگا کہ کہیں اسے نزلہ نہ ہو جائے۔ ایک گرم اور بند کمرے سے یکایک اس طرح کھلے میں نکل آنا اچھا نہیں۔ اسے اس ہندستانی لڑکے کا خیال آیا جسے تھوڑے دن ہوئے نمونیا ہو گیا تھا۔ اور کہیں اسے بھی کچھ اس قسم کی بیماری

ہو گئی تو اس کا سارا "کیریر" چوپٹ ہو جائیگا۔

"مسٹر عارف! ہم جا کہاں رہے ہیں؟" چھوٹی سی خوب صورت لڑکی نے پوچھا اور مسکرا کر عارف کی طرف دیکھا۔

یہ سوال سن کر عارف کو پورا یقین ہو گیا کہ لڑکی ان پر ریجھ گئی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر ایک فاتحانہ انداز سے مسکرائے اور انہوں نے جواب دیا۔ "کہیں چل کر کیوں نہ ایک ایک پیالی قہوہ پیا جائے، اور پھر اس کے بارے میں باتیں ہوں گی!"

"دیر بہت ہو گئی ہے۔" لڑکی نے کچھ اس لہجے میں جواب دیا جس میں رضامندی شامل معلوم ہوتی تھی۔

"لافنس کارنر ہاؤس دس پندرہ منٹ چل کر ہم پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں اتنی دیر ہوئی وہاں تھوڑی اور سہی۔ چلئے بھی۔" عارف نے کہا۔

اور یہ کہہ کر ان دونوں نے کارنر ہاؤس کا رستہ لیا۔

عارف نے اپنے دل میں اب طرح طرح کے منصوبے باندھنے شروع کئے۔ اس نے سوچا کہ قہوہ پینے کے بعد وہ اس لڑکی کو اپنے گھر لے جائیگا۔ لیکن کیسے؟ کس طرح سے وہ اس مضمون پر اس سے باتیں شروع کرے؟ یہی تو ان معاملوں میں سب سے بڑی مشکل ہوتی ہے۔ ابتدا ایک مرتبہ ہو جائے تو پھر ساری کارروائی سہل ہے۔ ابتدا، ابتدا یہی سب سے اہم بات ہے!

"ہم ایک گھنٹے سے ساتھ ساتھ ہیں۔ لیکن آپ نے مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آپ کیا کرتی ہیں۔" عارف نے پوچھا۔

"کون؟ میں؟ میں کرتی کیا ہوں!" لڑکی قہقہہ مار کر ہنسی۔ "اکثر تو میں فاقہ کرتی ہوں

profakhar.blogspot.com

گو کہ میری شکل دیکھ کر کسی کو اس کا واہم و گمان تک نہ ہوگا۔"

"اس کے کیا معنی؟" عارف نے خیال کیا۔ "کپڑے تو اتنے شاندار، اور ایسی بنی ٹھنی دیکھنے میں تو لڑکی کافی خوشحال معلوم ہوتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ فاقہ کرتی ہے۔"

عارف نے اس کے ساتھ ہمدردی کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ لیکن آپ کوئی نوکری کیوں نہیں کرتیں؟"

"ملتی ہی نہیں۔" لڑکی نے پھر ہنس کر کہا۔ "میں ایکٹریس بننا چاہتی ہوں۔ سینما ایکٹریس تین چار برس سے اسی کام میں لگی ہوئی ہیں۔ لیکن مہینہ میں بس چار یا پانچ دن کی نوکری مجھے ملتی ہے۔ اور وہ بھی بالکل چھوٹے چھوٹے معمولی پارٹس کرنے کے لئے۔ بھلا کس طرح سے میں اس سے اپنی اصلی قابلیت دکھاؤں میرے خیال میں دنیا کے تمام پیشوں سے زیادہ فلم ایکٹنگ کا پیشہ مشکل ہے۔ لیکن خیر۔ مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ باوجود ان مصیبتوں کے میں نے اپنی زندگی کو کافی دلچسپ بنا لیا ہے۔ اور پھر میں یہ کہتی ہوں کہ پریشان ہونے سے فائدہ ہی کیا؟ میرے بہت سے دوست ہیں، ایسے ہی میرے ایسے لوگ، بے فکرے، بے روزگار جب ہمارے پاس بالکل ایک پیسہ بھی نہیں رہ جاتا تو ہم رات بھر اپنے کمروں میں ناچ کر گزار دیتے ہیں۔ مجھے ناچنے کا بہت شوق ہے۔ اور 'رمبا' تو مجھے بہت ہی پسند ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں 'رمبا' کافی اچھا ناچ لیتی ہوں ـــــ آپ کو ناچنے کا شوق ہے؟" اس نے عارف سے یکبارگی پوچھا۔

"جی ہاں۔ مجھے ناچنے کا بہت شوق ہے ... لیکن مجھے اس کی فرصت کم ملتی ہے" عارف نے جواب دیا۔ اس لڑکی کی باتوں سے اسے کچھ خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس قسم کی لڑکی ہے۔ اسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح کی باتیں اس سے کرے

وہ غریب تھی۔ لیکن پھر بھی خوش، اس کے کیا معنی؟ بھوکی ہو کر ناچتی تھی یہ کیا؟

"آپ معلوم ہوتا ہے اس قسم کے لوگوں میں ہیں جو ہر وقت پڑھنے لکھنے میں مشغول رہتے ہیں! آپ کا کبھی جی نہیں گھبراتا؟ آپ اپنی چھٹیاں کیسے گزارتے ہیں؟ آپ فرصت کے وقت آخر کیا کرتے ہیں؟" لڑکی نے پوچھا۔ اس کے چہرہ سے دراصل حیرت اور استعجاب ٹپک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ اس قسم کے نوجوان سے کبھی ملی ہی نہیں ہے۔

"میں ایک بہت مشکل امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔ آئی، سی، ایس کا امتحان، غالباً آپ نے اس کا نام تو سنا ہوگا۔ یہ ہندوستان کی بہترین نوکری کا امتحان ہے.... لیکن خیر، آپ کے لئے میں ناچنے ضرور چلوں گا۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ" عارف نے لڑکی کو خوش کر کے گفتگو کا پہلو بدلنے کی کوشش کی۔

لیکن لڑکی نے اس طرف کچھ توجہ نہیں کی۔ اس نے کہا: "آئی، سی، ایس یہ کیا چیز ہے؟.... اچھا اب میں سمجھی سول سروس!.... یہی گورنمنٹ کے دفتروں میں نوکری! بچپن میں جہاں رہتی تھی۔ اس کے پاس ایک بڈھا سول سروس کا رہتا تھا، خشک، سوکھا سا انسان..... اور اسے ہمیشہ بدہضمی کی شکایت رہتی تھی! آپ سول سروس میں کیوں جانا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے یہ تو بڑی غیر دلچسپ مہمل سی چیز ہے۔"

عارف نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، اس نے کہا کہ "ہندوستانی سول سروس بالکل دوسری چیز ہے۔" لیکن اس چھوٹی سی سینما ایکٹریس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ اس نے ہاں ہوں کچھ اس طرح سے کہا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی دلچسپی عارف میں کم ہوتی جا رہی ہے اور عارف کی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ وہ اتنی دیر جاگنے کی وجہ سے تھک گیا تھا اب اس کو ان باتوں سے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ کچھ اس لڑکی کی حماقت پر غصہ آ رہا تھا کچھ اپنی

prokarbar.blogspot.com

کامیابی پر۔ لیکن اس حسین عورت کی اتنے قریب موجودگی، رہ رہ کر اس کے جذبات کو اور مشتعل کر دیتی تھی۔ اس لڑکی کے جسم سے عطر کی ہلکی ہلکی خوشبو، چست کوٹ میں ابھرا ہوا سینہ اور اس کے لب ذرا موٹے سے مگر دلفریب، جیسے رسیلے انگور، اور اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں جو رات کے اندھیرے میں اور زیادہ سیاہ معلوم ہوتی تھیں۔ عارف کو انہی چیزوں کا اس وقت احساس تھا۔ اس کی گفتگو، یہ سڑک، غرض اس لڑکی کے نوجوان جسم کے علاوہ ہر چیز اُسے فضول معلوم ہونے لگی۔

وہ چلتے چلتے برٹش میوزم کے پیچھے آ گئے۔ ایک طرف لندن یونیورسٹی کی نئی عمارتیں بن رہی تھیں آدھی بنی ہوئی دیواریں، سیڑھیاں، مچانیں اور پتھر اٹھانے والے کرین۔ لکڑی کی چہار دیواری کے اندر سے اوپر اُٹھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے، اور چوڑی سی سڑک کے دوسری طرف میوزیم کے اونچے اونچے کھمبے اور نیچے چبوترے پر بیچوں بیچ دو پتھر کے بڑے بڑے شیر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت یہاں بالکل تنہائی تھی۔ عارف نے خیال کیا کہ اب چند منٹ میں وہ کارنر ہاؤس میں پہنچ جائیں گے اور وہاں پھر تنہائی کہاں۔ اس نے ہمت کر کے اپنا ہاتھ اس لڑکی کے ہاتھ میں ڈال دیا۔ پھر اس کو ذرا دبایا لڑکی نے اسی طرح اس کے ہاتھ کو ذرا سا دبایا۔ اب عارف کو خوشی ہوئی اس نے سوچا کہ اگر وہ لڑکی اسے پسند نہ کرتی تو کیوں وہ اس بات کی اجازت ہی دیتی کہ وہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ڈالے اور پھر یہی نہیں اس نے اس کے ہاتھ کو دبایا بھی۔ عارف سمجھا کہ اسے پوری کامیابی ہوگی۔

لیکن پھر اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ کہیں وہ اس سے روپے وصول کرنے کیلئے تو یہ حرکتیں نہیں کر رہی ہے۔ اس کی گفتگو سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے عارف کچھ زیادہ

پسند نہیں، پھر یہ ہاتھ دبانا کیسا؟ پھر اسے کچھ اس لڑکی کی غربت پر افسوس آیا۔ "کیا حرج ہے" اس نے دل میں کہا "اگر اس کی مالی امداد بھی کچھ ہو جائے۔ عورتوں پر تو بہر حال روپیہ خرچ ہوتا ہی ہے، چاہے وہ بیوی ہو یا طوائف یا اس قسم کی کوئی لڑکی۔" عارف کی ہمت اب کچھ اور بڑھی۔ اس نے بڑی محبت کے ساتھ لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا: "تم اس قدر خوب صورت ہو!"

"سچ؟" اس نے یوں ہنس کر کہا۔ جیسے اس پر اس خوشامد کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ اور قبل اس کے عارف کچھ کہہ سکے اس نے میوزیم کے شیروں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ذرا ان کو دیکھئے! آپ نے کبھی غور کیا ہے یہ شیر کتنے بڈھے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے ان کے منہ میں دانت ہی نہیں۔ اور یہ یہاں صرف آٹھ دس برس ہوئے رکھے گئے ہیں۔ میرے ایک دوست ہیں، آپ کو ان سے ضرور ملنا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ شیر برٹش امپریلزم کے زوال، اس کے بڑھاپے کی تصویر ہیں۔ ان کے چہرے پر وحشیانہ شان باقی نہیں رہی، بلکہ سانپ کا زہریلا پن آ گیا ہے میرے خیال میں وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ مجھے بھی ان شیروں سے نفرت ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میں نے کبھی انھیں اچھی طرح نہیں دیکھا۔" عارف نے گھبرا کر جواب دیا ان باتوں سے اسے سخت الجھن ہونے لگی۔ پالٹیکس، پالٹیکس، جہاں جاؤ یہی تذکرہ رہتا ہے۔ اس کا دوست کوئی کمیونسٹ ہوگا اس نے یہ بے تکے خیالات اس لڑکی کے دماغ میں بھر دیئے ہیں، ورنہ اس سے اور برٹش امپریلزم سے کیا مطلب؟ اسے ان لوگوں پر سخت غصہ آیا۔ ہر جگہ یہ لوگ گڑبڑ اور فساد کرتے ہیں۔ ایک وہ احسان صاحب ہیں جو کسی ہندستانی طالب علم کو لندن میں چین ہی سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ جو کوئی سرکاری نوکری کا خیال بھی کرے

profakbar.blogspot.com

اسے غدار سمجھتے ہیں۔ گاندھی کو سرمایہ داروں کا غلام سمجھتے ہیں۔ جواہر لال نہرو کو یہ لوگ کمزور سمجھتے ہیں چونکہ وہ نازک موقعوں پر گاندھی جی کی پیروی کرتا ہے، اور یہاں ولایت میں تو یہ کسی کو اچھا سمجھتے ہی نہیں۔ بالڈون، لائڈ جارج، میکڈانلڈ، یہ سب سرمایہ داروں کے زرخرید غلام ہیں اور یہ لوگ کتنے مغرور ہوتے ہیں۔ ایک کمیونسٹ مینی فیسٹو پڑھ کر اپنے کو سب سے بڑا عالم فاضل خیال کرنے لگتے ہیں، ہر چیز پر طعنہ، ہر شخص کو برا بھلا کہنا، ہر بات میں برائی نکالنا۔ یہ ہے ان کا کام۔ ان شیروں میں آخر کونسی برائی ہے؟ لیکن عارف کو ہمت نہیں ہوئی کہ کھلم کھلا اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بات کرے جو اس لڑکی کو ناگوار گزرے۔

"ہوں" لڑکی نے آہستہ سے کہا اور گفتگو کا سلسلہ پھر بند ہو گیا۔ عارف کو اب یہ خیال ہوا کہ کسی طرح اس لڑکی کو خوش کرنا چاہیے۔ اس نے "ہوں" کچھ اس لہجے میں کہا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی صحبت سے گھبرا سی گئی ہے۔

"تمہارے بال کتنے اچھے ہیں۔" عارف نے مسکرا کر کہا۔

"دراصل آپ کا یہ خیال ہے؟" لڑکی نے خشک لہجہ میں کہا۔ اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ عارف کو پھر گھبراہٹ ہوئی، اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بس اسی جگہ اس لڑکی کو سینے سے چمٹا لے اور اس کے لبوں کا بوسہ لے۔ اس کے لب کتنے اچھے معلوم ہو رہے تھے اور اس کا جسم کیا اس لئے نہیں تھا کہ اسے گود میں لیا جائے؟ بہت ممکن ہے کہ یہ لڑکی خود بھی یہی چاہتی ہو اور اس قسم کی فضول باتوں سے گھبرا رہی ہو۔ عارف نے تہیہ کر لیا کہ وہ رسٹوران میں پہنچ کر قہوہ پیتے وقت ضرور اس لڑکی سے کہے گا کہ وہ اس کے ساتھ گھر چلے اور پھر عارف کو یقین ہونے لگا کہ وہ ضرور راضی ہو جائے گی، آخر ایکٹریس ہے، اسی قسم کی

زندگی بسر کرتی ہوگی۔

اتنے میں وہ چلتے چلتے "ٹاٹن ہم کورٹ روڈ" پر آ گئے۔ اگرچہ رات زیادہ جا چکی تھی مگر اس چوراہے پر اس وقت بھی رونق تھی۔ سینما کی بڑی بڑی دکانیں اور اس کی جگمگاتی ہوئی روشنیاں، لمبے لمبے سیاہ کوٹ پہنے ہوئے "پولیس مین"، ناچ گھر، کچھ لڑکھڑاتے ہوئے شرابی، کچھ لوگ موٹر بسوں کے رکنے کی جگہ پر کھڑے ہوئے اس کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک کونے میں دو تین اخبار والے کھڑے ہوئے تھے۔ پیدل چلنے والے تیز قدم چل رہے تھے۔ سردی زیادہ تھی۔

لڑکی اور عارف بالکل کارنر ہاؤس کے قریب آ گئے اور اندر داخل ہونے والے ہی تھے کہ لڑکی کی نظر ایک چھوٹے سے اخبار والے پر پڑی، جو سڑک کے کنارے دوسری طرف کھڑا ہوا تھا۔

"میں اپنے دوست کے لئے "ڈیلی ورکر" خریدنا چاہتی ہوں۔ ذرا معاف کیجیے گا" اور یہ کہہ کر وہ لپک کر سڑک کی دوسری طرف گئی۔

عارف اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔ اب تو اسے بالکل یقین ہو گیا کہ یہ لڑکی کمیونسٹوں کی صحبت میں رہ کر خراب ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ جو اخبار خریدنے گئی تھی وہ انہیں لوگوں کا اخبار تھا۔ اس کے اشتہار اخبار والے کے پاس دیوار پر لگے ہوئے تھے۔ بھوکے مزدوروں کا عظیم الشان جلوس، اور اس پر سرخ رنگ کا ہتھوڑا اور ہنسیا کا نشان بھی بنا ہوا تھا۔

لڑکی کے اس طرح سے یکبارگی ساتھ چھوڑ دینے پر عارف کو غصہ آیا، لیکن دو منٹ بعد وہ پھر واپس ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ عارف اس سے کچھ خفا ہے۔

"معاف کیجیے گا، مگر میرا ایک بہت بڑا دوست ہے جو اس اخبار کو جان سے زیادہ عزیز

pdfakbar.blogspot.com

رکھتا ہے۔ مجھے خود تو پالٹیکس سے زیادہ دلچسپی نہیں۔"

"کچھ مضائقہ نہیں" عارف نے کہا۔ اس نے اپنے دل میں تہیہ کرلیا کہ چاہے کچھ ہو اس لڑکی کو ضرور ان برے لوگوں کی صحبت سے بچائیگا۔ وہ ابھی سے اسے اپنی ملکیت سمجھنے لگا۔

اتنے میں ایک بس ان کے سامنے آکر رکی۔ لڑکی اُسے دیکھتے ہی اچھل پڑی "ارے یہ تو میری بس آگئی۔ یہ تو مجھے ٹھیک میرے گھر تک پہنچا دے گی۔ آپ برا تو نہیں مانینگے۔ اگر میں ابھی چلی جاؤں؟ اس کے بعد پھر کوئی بس نہیں۔ آپ کو مجھے ٹیکسی پر گھر پہنچانا پڑتا۔ آپ کا دام بچے گا......" اس نے یہ سب فقرے ایک سانس میں کہے اور قبل اس کے کہ عارف اس کی باتوں کا جواب دے سکے۔ وہ لپک کر بس میں سوار ہو گئی۔ "خدا حافظ" اس نے "بس" کے زینے پر سے مسکرا کر عارف سے کہا۔

"خدا حافظ" عارف نے آہستہ سے جواب دیا۔ بس روانہ ہو گئی اور وہ اسی جگہ کھڑا رہ گیا۔ پشیمانی، بے بسی، اور غصے نے اس کے سارے تن بدن میں آگ لگادی۔ اسے اپنی تنہائی کا اندوہگیں احساس ہوا۔ اس لڑکی کی ہنستی ہوئی صورت بھنور کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتی تھی۔ اب دوسری عورتوں کی طرف اس کا خیال جاتا بھی نہ تھا۔ لیکن اس لڑکی سے بعد کو بھی ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس کا پتہ تک نہیں معلوم تھا اور اب تو یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ خود عارف کا ذرّہ برابر بھی خیال نہ کرتی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی جگہ ساکت کھڑا رہا، پھر ٹیکسی لے کر اپنے گھر کی طرف سدھارا۔

(۳)

"تمہاری باتیں میری بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔" راؤ نے احسان سے کہا "ایک طرف تو تم ان ہندوستانی طالب علموں کی جو یہاں ہیں اتنی برائیاں کرتے ہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی

ذلیل ترین مخلوق ہیں، اور دوسری طرف اس بات کی بھی ان سے توقع کرتے ہو کہ وہ تمہارے ہم خیال ہو جائیں۔ اور اپنے فائدے کی باتوں کو چھوڑ کر اپنے ملک اور دنیا کے مسائل کو سمجھیں اور بڑی بڑی تحریکوں میں حصہ لیں۔ میرے خیال میں یہ حماقت ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم لوگ بالکل بیکار سی چیز ہیں۔ ہمارے ذہن میں اب کسی جدت کی طاقت باقی نہیں رہی، ہم ایک راستہ پر لگا دیئے جاتے ہیں، اسی پر چلنا فخر سمجھتے ہیں۔ دماغ اور روحانی موت اسی چیز کا نام ہے۔ کسی ایسی ذہنیت کو ان لوگوں میں ڈھونڈنا جس میں تازگی ہو یا سچائی کے بوجھ کو برداشت کرنے کی طاقت ہو، فضول کوشش ہوگی۔"

راؤ اور احسان، نعیم الدین کے گھر سے نکل کر پیدل ہی اپنے گھر جا رہے تھے۔ وہ دونوں ایک مکان میں رہتے تھے۔

"تمہاری منطق ہمیشہ تمہیں ایسی محفوظ جگہ پہنچا دیتی ہے جہاں بیکاری اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا ہی سب سے ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔" احسان نے جواب دیا۔

"یہاں کے ہندوستانی طالب علم، ہندوستان کے امیر طبقے کے نمائندے ہیں۔ اور یہ طبقہ ضرور ایسا ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب بحیثیت مجموعی اس میں کوئی بھلائی باقی نہیں۔ انہی بڑے بڑے راجاؤں، نوابوں اور رئیسوں کو لے لو۔ ان کی ذات سے کسی کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ ان مفت خوروں کو اس بات کا بھی تو سلیقہ نہیں کہ اپنی دولت اپنے ہی اوپر ٹھکانے سے خرچ کریں۔ یہ تو عیاشی بھی کرتے ہیں تو بدتمیزی کے ساتھ، بیہودے پن سے۔ دماغ کی جگہ ان کے سر میں گوبر بھرا رہتا ہے صرف ایک کام ان کو خوب آتا ہے ملک فروشی۔ اور اس مبارک کام کے لئے یہ بڑی بڑی قربانیاں تک کر سکتے ہیں۔ رہ گئے متوسط طبقے کے لوگ ان میں بہتیرے تو ایسے ہیں جو انہیں رئیسوں کے طفیل سے

زندہ ہیں۔ مثلاً، وکیل، بیرسٹر یا ایسے لوگ ہیں جو سرکاری نوکر ہیں یا بڑے بڑے پونجی پتی، مہاجن، سرمایہ دار، سمجھ تو ان لوگوں میں ضرور ہوتی ہے، لیکن ان لوگوں کے نزدیک اس کا مصرف صرف روپیہ جمع کرنا ہے۔ جیسے ایک بازاری عورت روپیہ کے لئے اپنا بدن بیچ دیتی ہے۔ یہ لوگ اسی طرح سے اپنی ذہنی طاقت کا بیوپار کرتے ہیں۔ یوں تو ان لوگوں میں بڑی بڑی خوبیاں ہیں، لیکن میرے خیال میں ان کی خاص صفت ان کا بوداپن ہے۔ جس طرح پرانے زمانے میں انسان اپنی جہالت کی وجہ سے ہر ہر درخت، ہر ہر پتھر میں خوفناک بھوتوں کو چھپا پاتے تھے۔ اسی طرح سے یہ لوگ چاروں طرف سے اپنے کو دشمنوں کے نرغے میں گھرا پاتے ہیں۔ گورنمنٹ کا ڈر راجاؤں مہاراجوں کا ڈر، مذہب کا ڈر، ملا کا ڈر، برہمن کا ڈر، ایک طرف سرکاری نوکر ہے تو اپنے افسر کے سامنے ایسا مسکین بنا رہتا ہے جیسے اپنے مالک کے سامنے دم دباتے ہوئے کتا ہو۔ اور اپنے سے نیچے درجے والوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہے، جس میں انسانیت کہیں چھو بھی نہیں جاتی، ڈانٹ ڈپٹ، گھرکی سے کم تو بات ہی کبھی نہیں کرتا۔ وکیل، مہاجن، سوداگر یا سرمایہ دار تو سب کی یہی تمنا رہتی ہے کہ کس طرح سے اس کے اور سارے ساتھی مٹ جائیں، تباہ ہو جائیں۔ اور ان کی ساری دولت سمٹ کر اس کے ہاتھ میں پہنچ جائے اور دوسری طرف ان تمام لوگوں کو اپنے سے نیچے طبقے والوں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ کہیں مزدور ان کے لئے مزدوری کرنا نہ چھوڑ دے، کہیں کسان یہ نہ کہنے لگے کہ زمین اسی کی ہے جو اس کو جوتتا ہے۔ کہیں کایا پلٹ نہ ہو جائے! یہ لوگ بار بار اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں کہ ہندوستان روس نہیں ہے لیکن اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی طاقت انہیں اب تو ایک دم بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ ترقی پسند تحریک میں انہیں اشتراکیت کا بھوت دکھائی دیتا ہے! انہیں لوگوں کے لڑکے ولایت تعلیم کیلئے آتے

ہیں ان سے بھلا ہمیں کیا اُمید ہو سکتی ہے۔!"

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں! پھر تم کیوں خفا ہوتے ہو؟" راؤ نے پوچھا۔

"اس وجہ سے کہ صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے" احسان نے تیزی سے جواب دیا۔ "ہم کیسا روزانہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے کہ انہیں طبقوں سے نکلے ہوئے افراد اپنی ذات اور اپنے خاص گروہ کے فائدے کو بھلا کر ہندوستان کے مظلوم انسانوں کی صرف حمایت ہی نہیں کرتے بلکہ بالکل ان میں مل جاتے ہیں اور اپنے طبقے کی بزدلانہ ذہنیت کو مطلقاً چھوڑ کر ایک ایسی انقلابی ذہنیت میں ڈوب جاتے ہیں جو ان میں آہنی ارادے، فولادی طاقتیں پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چند اشخاص اچھی طرح سے سمجھ لیتے ہیں کہ تاریخی حیثیت سے وہ امیر طبقہ جس میں کہ وہ پیدا ہوئے تھے، اب اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا ہے۔ اس کو موت کا پروانہ مل چکا ہے۔ کیونکہ اب اس کا وجود نسل انسان کی ترقی کے راستے میں حائل ہے۔ لیکن یہ تبدیلی، یہ سمجھ یکبارگی کسی میں پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ برسوں کی دماغی اور جسمانی مشقت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مزدور کی سمجھ میں تو یہ بات آسانی سے آجاتی ہے کہ اس کی محنت کا پھل اسی کو ملنا چاہیئے مگر امیر آدمی کی سمجھ میں اس بات کا آنا بہت مشکل ہے اس وجہ سے نہیں کہ یہ کوئی بڑی پیچیدہ بات ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں اس کا نقصان ہے۔ لیکن اس گروہ کے وہ اکّے دُکّے لوگ جو محنت مزدوری کرنے والوں کے انقلابی نظریوں کو قبول کر کے اس پر عمل کرنے کے لئے بھی آمادہ ہوتے ہیں۔ زیادہ تر طالب علموں ہی کے طبقے میں سے نکلتے ہیں۔ کیا یہ بہت بڑی غلطی نہ ہوگی۔ اگر ہم اس بات کی کوشش بھی نہ کریں کہ ہم ان طالب علموں کو جو ہمارے نئے خیالات کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وہ جن کے دل مردہ نہیں ہو چکے ہیں اور جن کے دماغ معطل نہیں اور جن کے جسم کام کرنے سے نہیں بھاگتے، ہم ان کو اس راستے کی

profakhar.blogspot.com

طرف دھانے میں مصروف ہیں۔ جدھر زندگی کی روشنی ہے، جدھر تکلیف اور مصیبت اور مشکل تو ضرور ہے لیکن موت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا نہیں جدھر ہر بے جو دہ بے حسی کا نام خوشی نہیں بلکہ جدھر مسرت کا ایک نیا احساس ہے، قدرت کی اندھی طاقتوں کو زیر کرنے کی مسرت، انسانوں کو بے شعوری، بد نظمی، اور خود غرضی کی بربریت سے نکال کر ایک منظم، مہذب اور متمدن دنیا بنانے کی مسرت، کام کی مسرت محنت اور مشقت کی مسرت۔"

احسان چپ ہو گیا۔ راؤ نے اس کی باتوں کا کچھ جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں خاموشی کے ساتھ چلتے رہے۔ پھر راؤ نے آہستہ سے کہا: "تم کہتے تو ٹھیک ہو۔ لیکن کیا کیا جائے۔ یہ لوگ تمہاری باتیں تک سننا گوارا نہیں کرتے۔ پھر کیسے ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرو گے؟ یہ طالب علم تو صرف نوکری اور روزگار کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اور چند جو تمہاری باتیں سنتے بھی ہیں۔ وہ میری طرح کے ہیں۔ سنا، سمجھے، اور پھر بھول گئے۔ یا بہت کیا تو لال ٹائی لگا کر کسی سوشلسٹ میٹنگ میں چلے گئے اور ایک دو کتابیں اسی مضمون پر لے کر پڑھ لیں۔ لیکن ان کی طرز زندگی میں بالکل کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ایسا کیوں ہے؟ کبھی کبھی میرے اپنے دل میں یہ سوال اٹھتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ میں تمہارے خیالات سے ہمدردی تو کرتا ہوں مگر کبھی تمہارے ساتھ ہو کر باقاعدہ کوئی کام نہیں کرتا؟ ایک عجیب طرح کی ذہنی تساہل سی ہے جو ہم پر چھائی رہتی ہے۔ جیسے تپ دق جسم کو تھوڑا تھوڑا آگ میں جلا کر آخر کار اسے بالکل خاک کر دیتا ہے اسی طرح میں سمجھتا ہوں آتما کا بھی ایک روگ ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ ہماری روح کو بے حس کر کے اسے بالکل مردہ کر دیتا ہے۔"

"خیر یہی بہت ہے کہ تمہیں احساس تو ہے کہ اس قسم کی کوئی بیماری ہوتی بھی ہے تو وہ لوگ ہیں جنہیں اس کا احساس تک نہیں۔"

...ن زندگی تمنا ہے؟ یہ احساس باقی ہوتا تو پھر ہم انہیں مردہ ہی کیوں کہتے!

(۳)

اعظم نے اپنے کمرے میں پہنچ کر گیس جلائی، ٹوپی اتار کر پلنگ پر پھینکی اور بغیر اوور کوٹ اتارے آتشدان کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اندھیرے کی وجہ سے کوئی چیز اچھی طرح وہاں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایک طرف دیوار پر کتابوں کی چھوٹی سی الماری، اس کے نیچے میز، ایک دو کرسیاں کونے میں پلنگ۔ کمرہ بالکل چھوٹا سا تھا اور میز کرسی کا اسباب سے بالکل بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا اس تاریکی میں اعظم کو ان گلیوں کا خیال آیا۔ ہندوستان کے شہروں کی گلیاں، دلی، لکھنؤ، بنارس جن میں رات کو بالکل تاریکی رہتی ہے یا جہاں روشنی بہت کم ہوتی ہے! ایک مرتبہ بڑی رات گئے وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ چوک جا رہا تھا۔ بالکل اندھیرا تھا۔ نالیوں میں سے بو آ رہی تھی۔ چلتے چلتے ایک طرف روشنی دکھائی دی۔ جو ایک کوٹھڑی کے دروازہ میں سے آ رہی تھی۔ ادھر جو نظر پڑی تو دیکھا کہ دو بڈھے ایک تخت پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے جسم پر سوائے چھوٹی چھوٹی تہبندوں کے اور کچھ بھی نہیں، سفید داڑھیاں، گردنیں جھکی ہوئیں اور ان کے سامنے شطرنج بچھی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اتنے بڑے شہر میں صرف یہ دو بڈھے اس وقت جاگ رہے تھے اور ان کی لالٹین کے سوا شہر کی باقی روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ اعظم اور اس کا دوست ذرا دیر کے لئے وہاں رک گئے۔ لیکن ان دو بڈھوں نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس وقت اعظم کو ان دونوں کا خیال کر کے کچھ خوشی ہوئی۔ یہ کس بات کی خوشی تھی؟ ایک پرانی یاد جس پر وقت کی منوں خاک پڑی ہوئی تھی۔ اس وقت کیوں اس کے ذہن میں جاگ اٹھی؟ پھر اسے اپنے دوست کا خیال آیا۔ جو اس کے ساتھ تھا۔ اسے تین برس سے اس کی خبر نہیں معلوم ہوئی تھی۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد اس نے نوکری کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کا نام تھا۔ بشمبھر۔ اس کی شادی تو اسی وقت ہو گئی تھی۔

profakbar.blogspot.com

اب اس کے بچے بھی ہوں گے شاید دیہات میں کہیں وہ رہتا ہوگا۔ اس کے پاس ایل ایل بی تک پڑھنے کے روپے نہیں تھے۔ شوہر کے بیوی اور بچے ضرور تکلیف میں ہوں گے۔ آجکل بے روزگاری کتنی بڑھتی جا رہی ہے! اس کا انجام کیا ہوگا؟ میرا انجام کیا ہوگا؟ میں اپنے امتحان میں پاس ہوں گا یا نہیں؟ اور اگر ہو بھی گیا تو پھر اس کے بعد نوکری بھی ملے گی یا نہیں؟ اور جو لوگ گولی سے مارے گئے ان کے بیوی بچوں کا کیا حشر ہوگا؟

اعظم کو اپنی چھوٹی بہن کا خیال آیا جس کا سن کوئی بارہ برس کا تھا۔ اس ہفتہ گھر سے اس کا خط آیا تھا۔ جس میں لکھا تھا ہم سب کو آپ کے آنے کا بڑا انتظار ہے۔ اب جلدی سے آجائیے۔ امی بھی ہر وقت آپ کی کامیابی کی دعا کیا کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ آپ کے لئے انہوں نے بڑی اچھی سی دلہن چُنی ہے....." اس خط کو پڑھ کر بھی اسے گھر جانے کی بالکل خواہش نہیں ہوئی۔ اپنے بوڑھے ماں باپ، اپنے چھوٹے چھوٹے بھائیوں سے ملنا تو وہ ضرور چاہتا تھا لیکن اس کے دل میں امتحان میں کامیاب ہو کر جلدی سے گھر واپس جانے کی وہ اُمنگ جو شروع شروع میں تھی اب باقی نہیں رہی تھی "امی نے میرے لئے اچھی سی دلہن چُنی ہے" اسے اس خیال پر ہنسی آئی۔ کیوں نہیں؟ آخر ہندوستان ہی میں کیا تمام دنیا میں سینکڑوں برس سے یہی چلا آیا ہے۔ ہر چیز یہاں بازار کے لئے ہے۔ میں بھی وہی کیوں نہ کروں جو سب کرتے ہیں لیکن محبت؟ عشق؟ اس کی بھی کوئی جگہ ہمارے تمدن میں ہے؟ اس کا خیال پھر آج شام کے واقعات کی طرف گیا اور پھر اسے اپنی محبت کی ابتدا یاد آئی۔

"کیا اسی چیز کا نام محبت ہے؟ پہلے روز جب وہ جمیلہ سے ملا تھا۔ اور ان دونوں نے ایک ساتھ دعوت میں کھانا کھایا تھا! وہاں پندرہ بیس آدمی مرد اور عورتیں اور بھی تھے لیکن اس کی نظروں میں بس یہی ایک لڑکی سما گئی تھی۔ پھر اس کے کئی دن بعد جب وہ پہلی مرتبہ یہاں

آئی تھی یہی کمرہ تھا۔ اسی کرسی پر وہ بیٹھی تھی۔ پھر میں نے اسے گود میں لے کر پیار کیا تھا! اس کے بعد سے اور دن اور راتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے کوشش کی کہ وہ کسی دوسری بات کا خیال کرے۔ گذشتہ خوشیوں کی یاد بہت تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔

وہ یکبارگی اٹھ کھڑا ہوا اور بجلی کا بٹن دبا کر کمرے میں روشنی کی۔ اس کی نظر آئینے پر پڑی۔ قد آدم آئینہ جو الماری کے پٹ پر لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنی صورت پر نظر ڈالی، اس کی داڑھی ذرا بڑھ آئی تھی اور اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔ وہ آئینے کی طرف سے مڑ گیا۔ اور اس نے کپڑے اتارنے شروع کئے۔

"اگر جمیلہ اس وقت میرے ساتھ آگئی ہوتی تو کیا اچھا ہوتا۔ توبہ توبہ کوشش بھی کرتا ہوں پھر بھی اس کا خیال آہی جاتا ہے۔ آج وہ کتنی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن مجھے کیا۔ مجھے کیا۔ اور یہ زندگی کتنی دوبھر معلوم ہو رہی ہے! کسی طرح سے میری طبیعت کسی طرف اور مائل ہو جاتی۔ پیرس! لوگ کہتے ہیں کہ انسان پیرس میں دنیا کے سب غم غلط کر سکتا ہے، غلط، غلطی اتفاق غلطی اور اتفاق۔ یہی دو راستے ہمیشہ مصیبت اور رنج کی منزل تک پہنچاتے ہیں تو میں کہاں جانا چاہتا ہوں؟"

اس نے شب خوابی کے کپڑے پہن لئے۔ اسے تھکاوٹ معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے ایک انگڑائی لی۔ بجلی کی روشنی بند کی اور کود کر بستر میں گھس گیا۔ چادر اسے برف کی طرح ٹھنڈی معلوم ہوئی وہ سردی سے کانپنے لگا۔ لیکن ذرا دیر میں بستر گرم ہو گیا۔ اور اس نے پیروں کو پھیلا کر کروٹ بدلی: "آج شام کو رسل اسکوائر اسٹیشن پر مجھے کتنی سردی کھانی پڑی اور ذلت بھی میری ہوئی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ داؤ مجھے مل گیا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو کیا ہوتا؟ جمیلہ آج میں اس کے ساتھ ناچا تو ضرور مگر وہ خوشی جو مجھے شروع شروع میں اس سے ملنے سے ہوئی تھی نہیں

profakbar.blogspot.com

ہوئی خوشی؟ اصلی بہشت وہ ہے جسے ہم کھو چکے۔ یہ کس کا قول ہے؟ فرانسیسی ناول نویس ارادہ، کوشش، سمجھداری، جدوجہد یہ سب محض لفظ ہیں، اور اس طرح کے جن کا تعلق مستقبل سے ہے اور اس لئے فضول ہیں۔ لیکن گزشتہ کی یاد بھی کچھ مسرت نہیں پہنچاتی۔ یادیں کیا ہیں؟ اصلیت سے کتنی مختلف ہوتی ہیں۔ خوشی کا ایک موقع اور کچھ تھوڑے دنوں بعد اس کی یاد دونوں بالکل الگ الگ چیزیں ہیں۔ پھر بھی ایک ہیں۔ اکیلا ہونا بھی اس دنیا میں کتنا برا ہے کاش کہ جین اس وقت میرے ساتھ ہوتی۔ آخر کیوں چلی گئی؟ پیرس، اگر اس وقت میں وہاں ہوتا تو اچھا ہوتا۔ وہی عورتیں جو اس مرتبہ دیکھی تھیں، ہوتیں۔ میں بھی اس زمانہ میں کیا احمق تھا سو فرانک بالکل مفت میں خرچ کر ڈالے۔ بالکل برہنہ عورتیں۔ ان میں ایک نے میرا ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر رکھ لیا تھا۔ پھر میں وہاں سے بھاگ آیا۔ تاریک۔ گلی سی تھی اور دروازے پر سرخ لیمپ لگا ہوا تھا۔ راؤ کہتا ہے کہ فرانس مفت میں بدنام ہے۔ برائی کہاں نہیں فرانسیسیوں میں ہاں ریاکاری اوروں سے کم ہوتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم ......

جین تم یہاں کہاں؟ تم اور پیرس؟ آج تمہیں میرے پاس آنے کی چھٹی کیسے مل گئی؟ کیا میری امی جان کے ڈر کی وجہ سے تم میرے پاس نہیں آتی تھیں بے وقوف لڑکی! میرے پاس بہت روپے ہیں۔ میں اپنے والدین کا محتاج نہیں۔ تم نے کپڑے کیوں اتار ڈالے! تمہیں سردی نہیں لگتی؟ آؤ شطرنج کھیلو گی میرے ساتھ۔ یہ باجہ کتنے زوروں میں بج رہا ہے مجھے پسند نہیں۔ اب تم واپس تو نہ جاؤ گی ...... یہیں رک جاؤ اب کبھی میرے پاس سے نہ جانا...... یہ میری چھوٹی، آمنہ ہے۔ اس سے تو مل لو ......

ساتواں باب

شیلا اور نعیم کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ جھوٹے گلاس، خالی بوتلیں، بجھے ہوئے سگرٹ کے ٹکڑے اور خاک سے بھری ہوئی خاکدانیاں، رکابیاں، بعض خالی اور بعض میں روٹی اور بسکٹ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ادھر ادھر بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ گراموفون بجنا بند ہو گیا تھا مگر وہ ابھی ایک میز پر کھلا رکھا تھا۔ اس کے چاروں طرف میز اور کرسی پر ریکارڈ بکھرے پڑے تھے۔ آتشدان میں آگ قریب قریب بجھنے والی تھی۔ کمرے میں سگرٹ کا دھواں بھرا ہوا تھا اور ہوا بھاری معلوم ہوتی تھی۔

نعیم نے شیلا سے کہا: "آپ تشریف رکھیے۔" شیلا کھڑکی کے پاس تھی۔ نعیم بھی اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"میرا تو یہاں دم گھٹ رہا ہے۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ان پردوں کو کھسکا کر کھڑکیوں کو کھول دیجئے۔ اس کمرے میں تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔"

نعیم نے کھڑکیاں کھول دیں اور نیچے سڑک پر ایک نظر ڈالی۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ وہ کھڑکی سے سر نکالے ذرا دیر کے لئے وہیں کھڑا رہ گیا۔ شیلا بھی اس کے قریب آ کر باہر جھانکنے لگی۔ آسمان صاف ہو چکا تھا اور سامنے کے مکانوں کی چھت کے اوپر سے آدھا چاند

prolakbar.blogspot.com

دکھائی دے رہا تھا۔ زرد سا چاند جس کی روشنی زمین تک آتے آتے غائب ہو جاتی تھی۔

شیلا نے کہا۔ "لندن میں چاند کتنا بڑا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں چاند تو دکھائی دیتا ہے مگر چاندنی کبھی نہیں ہوتی۔"

نعیم نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اتنے میں نیچے سڑک پر ایک ٹیکسی گزری اور برابر کے مکان کے سامنے آکر رک گئی۔ اس میں سے ایک عورت اور ایک مرد باہر نکلے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو گلے لگا کر لبوں کا بوسہ لیا۔ اس کے بعد عورت دوڑ کر مکان کے اندر چلی گئی اور مرد ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ سڑک پر پھر خاموشی چھا گئی۔ شیلا اور نعیم کھڑکی سے ہٹ کر آتشدان کے قریب آ گئے۔ نعیم ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ شیلا آگ کے پاس کھڑی رہی۔

"مجھے اب گھر جانا چاہیئے۔" شیلا نے کہا۔

"بیٹھئے، ذرا دیر تو بیٹھئے۔" نعیم نے کچھ سہمتی، کچھ لجاجت سے کہا۔

شیلا کچھ نہیں بولی۔ اس کے چہرہ سے تھکاوٹ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کہا: "آج کی پارٹی بھی کیا پارٹی تھی۔"

"امید ہے کہ آپ کی طبیعت تو بالکل نہیں گھبرائی ہو گی عجب عجب قسم کے آدمی جمع تھے۔"

"جی نہیں۔ میری طبیعت تو بالکل نہیں گھبرائی۔ بلکہ آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ لیکن اب میں کچھ تھک سی گئی ہوں۔ دیر تو بہت ہو گئی ہے۔"

"آپ دل میں کہتی ہوں گی کہ آخر میں نے کیوں آپ کو اصرار کر کے روک لیا ہے۔ سب چلے گئے۔ اور آپ کو بھی اب نیند آتی ہو گی۔ لیکن معلوم نہیں کیوں میری نہ صرف نیند ہی اڑ گئی ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میرے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا ہے جس طرح ہندوستان میں برسات میں طوفان آتا ہے۔ کالی کالی گھٹائیں جب گھر آتی ہیں

اور رات کو اور اندھیری کر دیتی ہیں، اور اس اندھیرے میں بار بار بجلی جب چمک اٹھتی ہے اور آسمان اس سرے سے اس سرے تک کانپ اٹھتا ہے۔" نعیم چپ ہو گیا اور اس نے سر اٹھا کر شیلا کی طرف دیکھا۔

"نعیم برائے مہربانی مجھ سے اس قسم کی باتیں مت کرو۔" شیلا کا چہرہ اس وقت غم کی تصویر معلوم ہو رہا تھا۔

"کیوں؟"

"اس وجہ سے کہ تم مجھے بہت اچھے معلوم ہوتے ہو۔ مگر مجھے کسی اور سے محبت ہے۔" اس نے بڑی دھیمی آواز میں اپنی گفتگو کو جاری رکھا۔ "وہ بھی ایک ہندوستانی طالب علم تھا۔ اور ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔"

نعیم کے دل میں عجیب ہیجان برپا تھا۔ محبت، ہمدردی، رشک کے جذبات اسے اتنا زیادہ پریشان کر رہے تھے کہ وہ مبہوت سا ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اپنے کو بھول جائے کسی طرح اپنی خواہشوں ناامیدیوں اور غم کے طوفان سے بچے۔

"وہ تھا کون؟ تم اس سے کب ملیں؟ اور اب وہ کہاں ہے۔" نعیم نے شیلا سے بیساختہ پوچھا۔

شیلا نے نعیم کی طرف دیکھا۔ پھر وہ کرسی پر لیٹ سی گئی۔ "یا خدا! میں پاگل تو نہیں ہو جاؤں گی! ڈیڑھ برس ہو گئے! پہلے خط آتے تھے اب وہ بھی نہیں۔ اور اب دنیا میں کوئی شخص بھی نہیں جس سے میں اس کے بارے میں باتیں کر سکوں.... تم پوچھتے ہو وہ کون تھا۔ سنو یہ کئی سال کا واقعہ ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں میں ایک نیلی جھیل کے کنارے چھوٹی سی بستی تھی جس میں کل ملا جلا کر کوئی پچیس تیس گھر رہے ہوں گے۔ کیا میں اسے بھول سکتی ہوں؟ گرمیوں کے دن تھے جولائی کا مہینہ اور کتنا خوشگوار موسم تھا، دھوپ چاندنی سی نکلی ہوئی تھی۔ اور آسمان گہرے نیلے

profakbar.blogspot.com

رنگ کا تھا۔ بادل کے چھوٹے چھوٹے سفید ٹکڑے روئی کے گالوں کی طرح آہستہ آہستہ اُڑ رہے تھے۔ دور کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف سفید دودھ کی طرح چمک رہی تھی۔ کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے جو سفید بھیڑ کے گلوں کی طرح پہاڑوں کے دامن سے چپکے ہوئے تھے۔ برف کو چھپالیا تھا۔ اونچی اونچی چوٹیوں کے نیچے گہری وادیاں دکھائی دے رہی تھیں جن پر سایہ چھایا ہوا تھا۔ .....

میں ایک کیفے کے سائبان میں اکیلی بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ قریب ہی ایک ہندوستانی لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، پھر ان دلکش پہاڑوں اور ان پر دھوپ چھاؤں کے نظاروں کی طرف دیکھنے لگی۔ ۲۰ منٹ بعد وہ اٹھ کر چلا گیا۔ ہاں جاتے وقت مجھ پر بھی اس نے ایک نظر ڈالی۔ میں نے اپنا رُخ دوسری طرف کرلیا۔ ہماری پہلی ملاقات! یہ اتفاق ہماری زندگی میں کیسے ہوتے ہیں! اور پھر ان کی وجہ سے ہماری زندگی کی رفتار اور رُخ کیسے بدل جاتے ہیں! اس کے بعد دو دن گزر گئے اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ صرف اس کے گھنے سیاہ بال، بڑی آنکھیں، پتلے ہونٹ اور چھوٹی سی ناک اور اس کے چہرہ کا وہ رنگ، دھوپ میں جلا ہوا، تانبے کا سا، میرے دماغ میں کبھی کبھی چکر لگا جاتے۔ ایک دھندلی سی یاد جو کبھی کبھی چمک اٹھتی۔ اور بس۔ تیسرے دن میں جھیل کے کنارے گھوم رہی تھی۔ یکبارگی سامنے سے میں نے اُسے آتے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اس نے گردن ہلائی۔ کیا مجھے اس نے سلام کیا؟ میں گھبرا گئی۔ میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا میرے پاس سے نکل گیا۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں نے سخت بدتمیزی کی۔ اسی وجہ سے ہندوستانی ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ اس نے مجھے سلام کیا اور میں نے بجائے جواب دینے کے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ میں سوچنے لگی کس طرح اس کی تلافی کروں؟ اتنی چھوٹی بات ہے اگر اس سے ملاقات ہو اور میں اس سے معافی مانگوں تب بھی بُرا معلوم ہوگا۔ گھبراہٹ میں

انسان سے کیسی کیسی حماقتیں ہو جاتی ہیں۔ اور اب وہ مجھ سے ذرا سی بات کی وجہ سے نفرت کرنے لگے گا!

"اسی دن شام کو میں نے اسے پھر دیکھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں اپنے چھوٹے سے ہوٹل سے نکل کر اکیلی کھڑی برف کے پہاڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا اور آسمان روشنی کی اَن گنت رنگینیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ سفید برف پر بھی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے قریب کوئی شخص آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے مڑ کر ایک نظر ڈالی۔ وہی لڑکا! کیا ابھی تک مجھ سے خفا تو نہیں؟

تھوڑی دیر بعد میں نے کہا: "کتنا اچھا منظر ہے!"

"ہاں کتنا اچھا منظر ہے" اس نے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس جواب کا کیا مطلب نکالوں، کہیں وہ میرا مذاق تو نہیں اڑا رہا تھا، کہیں اس نے طنزیہ تو میرے ہی فقرے کو نہیں دہرایا۔ یا شاید اس نے اپنی اصلی رائے کا اظہار کیا تھا، شاید وہ مجھ سے خفا نہیں۔ شاید وہ اس دن کی بات بھول گیا تھا۔ ....."

"آپ اسی ہوٹل میں رہتی ہیں نا؟ میں آپ کو کئی دن سے دیکھ رہا ہوں" اس نے مجھ سے کہا۔

"میں خوش ہو گئی۔ مجھے اس کے انگریزی لہجہ پر کچھ ہنسی آئی۔"

"جی ہاں۔ میں تین دن سے یہاں ٹھہری ہوں۔ میں نے بھی آپ کو کئی بار ادھر ادھر دیکھا تھا" میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا: ہم یوں باتیں کرنے لگے جیسے ایک

profakbar.blogspot.com

دوسرے کو مدتوں سے جانتے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ لندن میں ڈاکٹری پڑھتا ہے۔ اور یہ اس کی پڑھائی کا آخری سال ہے۔ آئندہ سال وہ گھر واپس چلا جائے گا۔ وہ سوئٹزرلینڈ کے اس چھوٹے سے گاؤں میں ایک مہینے کے لئے آیا ہے۔ وہ بنگال کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام پال ہے۔ ہیرن پال۔ میں نے بھی اس کو اپنا نام بتایا اور کہا کہ میں بھی سوئٹزرلینڈ میں چھٹیاں گزارنے کے لئے آئی ہوں۔"

"رات کو میں ایک قہوہ خانے میں گئی۔ ہمارے گاؤں کا قہوہ خانہ و رستوران، اپنا گھر سب کچھ وہی تھا۔ ایک لمبا سا نیچی چھت کا کمرہ، جس کی لکڑی کی چھت اور لکڑی کے فرش سے خوشگوار خوشبو سی آ رہی تھی۔ چاروں طرف میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ ان کے گرد تین تین چار چار کرسیاں اور ایک طرف ذرا سے اونچے حصے پر ایک پیانو اور ایک ڈھول اور ایک ہارمونیم بجانے والا باجہ بج رہا تھا۔ ادھر ادھر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ تمام یورپ کی زبانیں وہاں سننے میں آ رہی تھیں۔ مجمع بہت تھا۔ قریب قریب تمام جگہیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں جگہ خالی تھی وہاں جا کر میں بیٹھ گئی اور قہوہ پینے لگی۔"

"تھوڑی دیر بعد ہیرن کو میں نے داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے ادھر ادھر جگہ ڈھونڈنے کیلئے نظر ڈالی۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں بھی اس وقت اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہماری نظریں ملیں اور وہ فوراً میری میز کے قریب آیا اور بغیر اجازت مانگے ایک کرسی کھینچ کر میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔"

"اس کی یہ بے تکلفی مجھے بری معلوم ہوئی یا نہیں۔ اس کا مجھے آج تک پتہ نہیں لیکن جب اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُسے اتنا نزدیک پایا تو میں تہذیب کے ان چھوٹے چھوٹے اصولوں کو بھول سی گئی۔ ہم وہاں گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ وقت تیزی سے گذرتا گیا۔

بہت تیزی سے۔ ہمارے میز سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک انگریز بیٹھا ہوا تھا۔ لال منہ، چھوٹی چھوٹی باریک مونچھیں۔ اس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے ایک ہندوستانی لڑکے کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھ کر جامے سے باہر ہوا جا رہا ہے۔ لیکن میں نے اس کی بالکل پروا نہیں کی۔ ہیرن نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں کی۔

"اس رات مجھ سے ہیرن کی کیا باتیں ہوئیں مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ شاید دنیا کا کوئی مضمون ایسا نہ رہا ہو جس پر ہم نے بحث نہ کی ہو۔ مجھے صرف یہ خوب یاد ہے کہ میں نے دو ایک ایسی باتیں کی تھیں جسے کہہ کر مجھے خود بعد کو شرم آئی۔ لیکن میں بے سوچے سمجھے بولتی چلی جاتی تھی۔ ہیرن بار بار مجھ سے سوال کرتا۔ میرے جوابوں کا جواب دیتا۔ کبھی میری غلطی صحیح کرتا۔ کبھی کبھی میں اگر اس سے متفق ہوتی تو صرف اس کا جواب سننے کے لئے میں اسے بیچ میں ٹوک دیتی۔ یا اس کی باتوں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتی۔ فوراً اسکی بھنویں تن کر اوپر اٹھتیں اس کی آنکھوں میں بجلی کی سی چمک آجاتی۔ اس کی آواز میں تیزی، گرمی، انہماک آجاتا جب وہ یوں بولتا تھا میں مشکل سے اس کی باتوں کو سنتی تھی۔ میں اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہ جاتی اور وہ بھی بات کرتے کرتے رک جاتا اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگتا۔"

"اس دن رات کو میں پلنگ پر لیٹے لیٹے دیر تک اس گفتگو کے مزے لیا کی۔ بار بار ہیرن کی آواز میرے کانوں میں آجاتی اور اس کی ہنسی، اس کی سیاہ آنکھوں کی چمک، اس کی مسکراہٹ میری آنکھوں کے سامنے پھرتی۔ میرا دل عجیب قسم کی مسرت سے بھرا ہوا تھا۔"

"اس کے بعد ہم دونوں ایک ساتھ ٹہلنے جاتے، ایک ساتھ ٹینس کھیلتے، جھیل میں نہاتے اور ساتھ ساتھ کھانا کھاتے۔ ہیرن اور میں دونوں اس گاؤں میں کسی اور کو نہیں جانتے تھے۔ ہر وقت کے اس طرح کے ساتھ سے ہم دونوں ایک دوسرے کو یوں جان گئے،

profakbar.blogspot.com

جس کے لیے لوگ عام طور سے برسوں تک جاتے ہیں۔"

"مجھے اس کی ہر بات پسند آنے لگی۔ میں نے اپنے دل میں یہ سوچا کہ اس سے زیادہ اچھے آدمی سے آج تک نہیں ملی۔ میری نظروں میں وہ سب سے زیادہ دلچسپ، دلکش، قابلِ پسند انسان تھا۔ مجھے یاد ہے انہیں خیالات کا اظہار میں نے ایک خط میں کیا تھا۔ جو انہیں دنوں میں نے اپنی دوست ڈورس کو لکھا تھا اور اس نے جواب میں لکھا تھا: 'شیلا! تم عشق میں مبتلا ہو گئی ہو۔ خبردار! یہ موسم سرما ہے اور اس زمانے میں جوانی کا خون کبھی کبھی سر پر چڑھ کر ہمیں پاگل بنا دیتا ہے۔ میں تم کو 'پاگل' ہونے سے نہیں روکتی، یہ تو تمہارا حق ہے۔ لیکن یہ مت بھولنا کہ تمہارا 'جنون' ممکن ہے دیرپا ہو۔ ممکن ہے وہ تمہاری تمام زندگی کو بنا دے یا بگاڑ دے.......'

"ڈورس کا خط ملنے کے بعد بار بار میں نے خود سے سوال کیا کیا یہ سچ ہے کہ میرا دل اس لڑکے پر آ گیا ہے؟ اسے میں پسند کرتی ہوں، اس سے میں باتیں کرنا چاہتی ہوں، اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، لیکن عشق، محبت؟ کیا اسی کو عشق کہتے ہیں؟ کیا یہی محبت ہے؟ وہ دن بھی کیسے تھے مجھے کسی چیز کی فکر نہیں تھی، میری اپنی ایک دنیا سب سے الگ تھی، اور اس جادو کے حلقے سے نکلنے کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آتا تھا۔"

"پھر وہ رات جب میں اس کے کمرے میں بیٹھی ہوئی اس سے باتیں کر رہی تھی، اوائل گرما تھی اس نے کھڑکی کھول دی، باہر بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بجلی کی ایک دو روشنیاں شہر پر بستیوں کی آڑ میں سے دکھائی دے رہی تھیں، درختوں کے خاموش، دھندلے خاکے پہاڑوں پر نظر آ رہے تھے اور پہاڑ خود ایک سیاہی کا انبار معلوم ہوتے تھے مگر آسمان بالکل صاف تھا۔ اور اس پر سینکڑوں ہزاروں ستارے جگمگا رہے تھے۔"

شیلا چپ ہو گئی، نعیم بھی کچھ نہیں بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ "میں کہوں کیا؟ انسان

کی قسمت میں یہ جگر خراشی، یہ کوفت، آخر کیوں لکھی ہے؟ میں کروں کیا؟ ہم کتنے بے بس ہیں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ روحانی مصیبت ہے جو ہمیں لاچار کر دے۔ جس کے سامنے ساری تدبیروں اور کوششوں کے دروازے بند ہو جائیں۔ جو ہمارے جذبات کو اتنا زیادہ ابھارے کہ پھر ان کا سلجھنا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہو جائے......"

شیلا اپنی کرسی پر یوں پڑی تھی جیسے وہ سو گئی ہو۔ نعیم اپنی جگہ سے بے ساختہ اٹھا اور شیلا کی کرسی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کی طرف گردن جھکائے دیکھتا رہا۔ شیلا ساکت پڑی رہی۔ نعیم جلدی سے ہٹ کر اس کی طرف سے منہ موڑ کر آتشدان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

شیلا نے کہا۔ "نہیں نعیم، نہیں، تم اور میں اس گتھی کو نہیں سلجھا سکتے۔ میں سمجھتی ہوں کہ مسرت کے بھی درجے ہوتے ہیں۔ جب ہم اپنی ذاتی، محدود خوشی کے تمام امکانات کھو بیٹھیں اور ہمارے دل یوں ویران ہو جائیں کہ ان میں یادوں کے بھوت کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ جائے تو پھر ہمارے لئے ان کھنڈروں کو چھوڑ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ زندگی تو رواں ہے۔ زندگی تو ہر وقت نئی نئی صورتوں میں ہمارے سامنے آتی ہے اور اب تو اس کا یہی تقاضہ ہے کہ ہم زیادہ اونچی سطح پر چلے جائیں اور وہاں سے زیادہ خوشیوں، زیادہ وسیع مسرتوں کی جستجو کریں جو صرف ہماری ذات تک محدود نہ ہوں۔ بلکہ جن میں تمام انسانیت شریک ہو........"

لیکن شیلا محسوس کر رہی تھی کہ آج وہ کھنڈر ویران نہیں بلکہ آباد ہیں وہ جانتی تھی کہ یہ ایک کہانی ہے جو ختم ہو جائے گی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اصلیت کی دنیا دوسری ہے لیکن اس وقت نعیم، یہ کمرہ اس کی موجودہ زندگی اسے سطحی اور نقلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ یہی سوچ رہی

profakbar.blogspot.com

تھی کہ بس وہی رات اصلی تھی۔ ہم دونوں کھڑکی کے نزدیک جا کر کھڑے ہو گئے۔ ہیرن اور میں اس نے کمرے کی روشنی بجھا دی، باہر کا منظر اور کمرے کی تاریکی اور ہیرن کا میرے بالکل قریب ہونا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے مجھ پر نشہ چڑھ گیا ہو۔ ہیرن نے آہستہ سے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں ڈری لیکن مجھ سے ایک حرف نہیں بولا گیا۔ ہیرن بھی بالکل خاموش رہا۔ اس سے کمزوری کے ساتھ ہاتھا پائی کرتا رہا لیکن وہ وحشیانہ بے خودی کے ساتھ مجھے پیار کرتا رہا۔ بس وہ ایک فقرہ آہستہ سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کہتا تھا "میری پیاری"۔ میری جان" ان دو ہی لفظوں میں اس وقت کتنے معنی تھے آخر کار میں نے ایک مرتبہ زور لگا کر اپنے کو اس کے پہلو سے چھڑا لیا۔ وہ میری طرف لپکا، لیکن میں دروازہ کھول کے کمرے سے باہر بھاگ گئی اور سیدھے اپنے کمرے میں جا کر دم لیا اور وہاں پہنچ کر میں نے رونا شروع کیا۔ باوجود کوشش کے میرے آنسو نہ تھمتے تھے۔ میرے دل دماغ جسم سب میں عجیب طرح کی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ میں سو گئی۔ اس کے پہلے شاید ہی مجھے کبھی اتنی گہری نیند آئی ہو۔

"اس کے بعد ہم جیسے ایک جان اور دو قالب ہو گئے۔"

"یہ اس رنگین کوہستانی علاقہ کی خوبصورتی تھی یا موسم کی لطافت تھی یا ہم دونوں میں چھپے ہوئے کسی ابدی مسرت کے چشمے تھے جو ابل پڑے تھے میں چاروں طرف اپنے کو ایک عجیب طلسماتی فضا میں گھرا ہوا محسوس کرتی تھی۔"

شیلا پھر بولنے لگی "تم نے کبھی پہاڑوں کی سیر کی ہے؟ پیدل! میلوں چڑھائی پر چل کے صنوبروں، آبشاروں اور گہری وادیوں کے بیچ میں؟ وہ ذرا دیر کے لئے رک گئی۔ نعیم اس کی طرف مڑ کر دیکھنے لگا لیکن کچھ بولا نہیں۔ معلوم ہوتا تھا شیلا خود سے باتیں کر رہی ہے۔

جھیل کے پاس سے ایک پتلی سی سڑک، کوئی دو گز چوڑی یا اس سے بھی کم، پہاڑ کے اوپر جاتی تھی۔ صنوبر کے بڑے بڑے درخت اس کے دونوں طرف سایہ کئے ہوئے تھے، دھوپ درختوں کی پتیوں سے چھن چھن کر سڑک پر اور کھائے کے پہاڑ پر آ رہی تھی۔ یہ سڑک رفتہ رفتہ بلند ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس پر آدھ گھنٹے چلنے کے بعد آدمی اس موسم میں پسینے پسینے ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ اتنی بلندی پر پہنچ جاتا تھا کہ وہاں سے جھیل کے کنارے ٹہلنے والے لوگ بالکل چھوٹے چھوٹے اور مکانات گھروندے معلوم ہوتے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اور صنوبر کی باریک نوکیلی پتیوں سے سرسراہٹ کی نرم اور گہری آواز آ رہی تھی۔ ایسی آواز جس کے اثر سے پہاڑوں کی عظمت انتہائی خاموشی کی جدوجہد اور کشمکش سے دوری کا احساس اور زیادہ بڑھ جاتا تھا۔"

"یہ سڑک پہاڑ کے دامن میں ایک پتلی ڈور کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے ایک طرف گہرا کھڈ تھا۔ اور دوسری طرف پہاڑ، جیسے پتھر کی ایک عظیم الشان دیوار جس کو دیوتاؤں نے اس ارادہ سے بنانا شروع کیا ہو کہ آسمان تک پہنچا دیں گے۔ لیکن اس دیوار میں جگہ جگہ پر گہرائیاں، شگاف اور غار تھے۔ پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے ان گہرائیوں اور چھوٹے مسطح حصوں پر پڑے ہوئے تھے۔ ان پتھروں پر سرخی مائل کائی سی ہوتی یا کبھی کبھی وہ بالکل سپاٹ ہوتے بالکل جیسے کسی آدمی کی چمکتی ہوئی گنجی کھوپڑی، ان کے ادھر ادھر کبھی ان کے اندر سے، دو ٹکڑوں کے درمیان، بڑے درختوں کی جڑوں کے پاس چھوٹے چھوٹے پھول، نیلے، سفید، گلابی رنگ کے یوں نکلے ہوئے تھے جیسے بڑے بڑھوں کے مجمع میں کسی بچوں کا ایک گروہ کہیں سے آ جائے اور ان کے گال نرم کی دھوپ سے لال ہو جائیں اور ان کی آنکھیں زمین میں گڑ جائیں۔"

"مجھے خوب یاد ہے اس وقت کوئی تین بج رہے ہوں گے، میں ہیرن کے ساتھ اسی سڑک پر اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ ہم ذرا جھک جھک کر لمبے لمبے قدم آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے آگے

profakbar.blogspot.com

بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہجوم کے ساتھ ہم گہری سانس لیتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہم دیر سے چل رہے تھے ہمارے ہاتھوں میں چھڑیاں تھیں، اور پاؤں میں بڑے بڑے بوٹ۔ ہم بالکل خاموشی کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ چند منٹ کے بعد ہم سڑک کے ایک کھلے ہوئے حصہ پر پہنچ گئے جہاں کھڈ کی طرف بڑے درخت نہیں تھے اور نیچے کی وادی کا منظر دور تک دکھائی دیتا تھا یہاں دھوپ پوری پڑ رہی تھی۔ ہم دونوں رک گئے اور سڑک کے کھلے ہوئے حصہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ ہماری نظروں کے سامنے عجیب منظر تھا۔"

"سرسبز پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک وادی سینکڑوں گز نیچے نظر آتی تھی جس کے بیچوں بیچ وہی جھیل تھی جہاں سے ہم چلے تھے۔ سورج کی کرنیں، اب صرف جھیل کے ایک حصہ پر پڑ رہی تھیں جو پارہ کی طرح نیلاہٹ لئے ہوئے چمک رہا تھا، دوسرا حصہ جس پر سایہ تھا گہرے سیاہی مائل نیلے رنگ کا تھا۔ جھیل کے ایک کونے پر جدھر دھوپ تھی نہانے والوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ جو اتنی دور سے چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس جگہ بڑی بڑی رنگ برنگ چھتریاں زمین سے گڑی ہوئی لگی تھیں، ان کے نیچے لوگ لیٹے ہوئے دھوپ کھا رہے تھے۔ چند ہوٹل بھی یہاں سے نظر آتے تھے۔ ان کے کمرے، یہاں سے بالکل کبوتروں کے کابک معلوم ہوتے تھے، وادی کے دوسری طرف کا پہاڑ عجیب و غریب تھا۔ اس کے نیچے کا آدھا حصہ درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن اوپر پہنچ کر یہ درخت کم ہوتے جاتے تھے۔ ان کی جگہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اگی ہوئی تھیں۔ اور بالکل چوٹی کے قریب پہنچ کر صرف بھوری چٹانیں رہ جاتی تھیں جن کی اونچی نیچی کنگھی کی سی لکیر سے سوئی کی طرح نوکیلی چوٹیاں نکلی ہوئی تھیں۔ اس پہاڑ کے پیچھے، جہاں تک نظر کام کرتی تھی کوہستانی علاقہ تھا۔ قطار اندر قطار، دور تک سر بفلک چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ افق کی حد پر پہنچ کر یہ

سب نیلے غبار میں چھپا ہوا برفستان کا سلسلہ نظر آتا تھا، جہاں دھوپ کی چمک اور سایہ برف کی سفیدی اور آسمان کی نیلاہٹ سب ایک دوسرے میں مل جل کر آنکھوں کے سامنے رنگ روشنی اور تاریکی، عظمت و بلندی کی ایک ایسی مکمل تصویر کھینچ رہے تھے، جس کا بیان کرنا ممکن نہیں۔"

"ہم دونوں چپ بغیر کچھ بولے ہوئے، ایک یا دو منٹ تک اس منظر کو دیکھتے رہے۔ ہم پر ایک عجیب قسم کی خاموشی چھا گئی! ان درختوں، پتھروں، پہاڑوں کے درمیان، اس آسمان اور ان بادلوں کے نیچے، اس گہری تنہائی میں ہم پوری طرح جذب ہو گئے تھے۔"

"جلدی کرنا چاہیئے۔" ہیرن نے میری طرف مڑ کر کہا۔ "ورنہ دیر ہو جائے گی۔ اور یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

میں بھی مڑی۔ "ہاں جلدی کرنا چاہیئے۔" میں نے آہستہ سے دہرایا اور آگے بڑھی۔

"اس کی آنکھیں، مجھے اس ہندوستانی کی آنکھیں، سب سے زیادہ اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی چمکدار سیاہی اور ساتھ ہی ساتھ ان کی نرمی۔ ..... میں سوچتی تھی یہ کمزوری تو نہیں، لیکن جب وہ ہندوستان کی باتیں مجھ سے کرتا تھا اور اپنے کاموں کی جو وہ ہندوستان میں کرے گا تو ان آنکھوں کی نرمی غائب ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں سے کبھی تو غم جھلکتا تھا اور کبھی آگ کے شعلے نکلنے لگتے۔"

"ہم لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے پہاڑ پر چڑھتے جا رہے تھے۔ پتھر کی سڑک پر ہمارے بوٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یکبارگی میرا دل بیٹھنے لگا۔ ہمارے اس عشق کا انجام کیا ہوگا؟ یہ سوال میرے ذہن میں چکر لگانے لگا۔ جیسے بچے اندھیرے میں بھوت سے ڈرتے ہیں، مجھے ڈر معلوم ہونے لگا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا، خوشی کا چراغ یکایک بجھ جائے۔"

profakbar.blogspot.com

"ہیرن کیا تم دراصل مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

ہیرن کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ اور سوال کا جواب دیئے بغیر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ پھر اس نے کہا:

"ہرگز نہیں! میں بھلا کس طرح تم سے محبت کر سکتا ہوں؟ ہم میں کون سی بات یکساں ہے؟ میں کالا تم گوری! میں ہندوستانی تم انگریز! میں بت پرست تم عیسائی! اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ میرے دل میں صرف تم سے نہیں بلکہ تمہاری ساری قوم سے نفرت بھری ہوئی ہے۔ نفرت اگرم کھولتی ہوئی نفرت۔ پھر میری جان، تم خود انصاف کرو کیسے میں تم سے محبت کر سکتا ہوں؟"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اور بات جیسے ختم ہو گئی۔ ہم چلتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد ہیرن بولا: "لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھے کبھی یہ وہم و گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ میں یورپ میں اس بری طرح سے عشق کے جال میں پھنسوں گا۔ اور اب تو تم ہی تم مجھے چاروں طرف نظر آتی ہو۔"

یہ سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی لیکن میں نے کہا: "یہ غلط ہے۔ مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آتا۔ تم نے اپنی زندگی کا ایک مقصد چن لیا ہے۔ یہ مقصد تمہیں مجھ سے بھی زیادہ عزیز ہے۔"

"کیا اس مسئلہ پر کبھی ہماری ایک رائے نہ ہو گی؟" ہیرن نے غمگین لہجہ میں کہا: "تم بار بار مجھ سے کیوں کہلوانا چاہتی ہو کہ انسانی زندگی کا دائرہ صرف عشق اور محبت تک محدود نہیں کیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے مسائل اور بہت سی دلچسپ اور غیر دلچسپ چیزیں بھی ہیں، جن سے ہم وابستہ ہیں؟ ان چیزوں کو چھوڑ کر ہم ایک خلائے محض میں رہ کر عشق نہیں کر سکتے، جس طرح زندگی کے لئے ہوا ضروری ہے میرے خیال میں اسی طرح تمہاری اور میری محبت کا

انحصار کم از کم میرے لئے ان مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش پر ہے، جنہیں تم کہتی ہو کہ میں تم سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ میری جان! تم میں اور ان مقاصد میں کسی قسم کا کوئی تضاد کوئی جھگڑا نہیں۔ تمہاری محبت مجھے اور زیادہ دلیر بنا رہی ہے۔ زندگی اب بھی مجھے مشکل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن تمہارے ساتھ ہونے سے یہ دشوار راستہ آسانی سے کٹ جائے گا۔ میں تم سے صرف ایک وعدہ کر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جہاں تک میرا بس ہے میں کبھی اس راستے پر تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا.... لیکن تم! کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ تم میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو؟"

"اس کا ایک ایک لفظ مجھے نہیں بھولتا۔ اس کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بے خود ہو کر جواب دیا "تمہارے ساتھ میں ہر جگہ، ہر طرف جانے کے لئے تیار ہوں۔ چاہے کوئی بھی راستہ ہو، جیسی بھی راہ ہو، اگر تم میرے ساتھ ہو میں بے دھڑک آگے بڑھتی چلی جاؤں گی۔" جیسے اس وقت، مگر میرے دل میں محبت کی مسرت ایک عجیب قسم کے رنج سے ملی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"ہم دونوں پر پھر خاموشی چھا گئی۔ سورج کے سامنے بادل کا ایک ٹکڑا آ گیا اور دھوپ چھپ گئی۔ ان کے دونوں طرف بلند صنوبر کے درختوں کا گھنا جنگل تھا۔ ساری سڑک پر صنوبر کی خشک پتیاں، تہ بہ تہ بکھری ہوئی تھیں جن پر چلنے سے پیر پھسلتا تھا۔ ان میں سے خوشبو آ رہی تھی۔ بادل آ جانے سے دنیا اندھیرا بھی تھا۔

"ہم ایک موڑ کے قریب پہنچے تھے کہ ایک بوڑھا سولجر کا رخ ہماری طرف آتا ہوا نظر آیا۔ وہ سبز رنگ کی چھوٹی سی ٹوپی پہنے تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اس قسم کے گہرے سیاہی مائل سرخ رنگ کا تھا جو کھلی ہوا، طوفان اور دھوپ میں زندگی بسر کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ اس کے گالوں

protarbar.blogspot.com

اور ماتھے پر لکیریں گہری گہری سیاہ کھائیوں کی طرح تھیں۔ لیکن باوجود اس کے وہ بڈھا طاقتور معلوم ہوتا تھا۔ اس کی پیٹھ پر پہاڑ پر چڑھنے والی رسی اور ایک گٹھڑی لدی ہوئی تھی، اور اس کے ہاتھ میں کوئی سوا گز لمبا ایک ڈنڈا تھا۔ جس کے دونوں کناروں پر لوہے کی موٹی کیلیں لگی ہوئی تھیں، نیچے کی طرف سیدھی اور اوپر آڑی۔ قریب پہنچ کر بڈھے نے ہماری طرف مسکرا کر دیکھا اور سلام کیا۔

"گڈ ٹاگ" اس نے کہا سوئس جرمن لہجہ میں۔

"گڈ ڈے" ہم نے ایک ساتھ جواب دیا۔ پھر بڈھا گائڈ ذرا دیر کے لئے رک گیا اور اس نے کہا: "آپ لوگ ذاکر جا رہے ہیں؟ جلدی کیجئے ورنہ طوفان میں پھنس جائیے گا۔ آسمان کا رنگ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

"ہم بھی رک گئے۔ ہیرن نے ٹوٹی پھوٹی جرمن میں گائڈ سے پوچھا: "یہاں سے ذاکر پہنچنے میں ہمیں کتنی دیر لگے گی؟"

"کوئی دو گھنٹے۔ اگر آپ لوگ تیزی سے جائیں۔ راستے بھر بالکل پناہ کی کوئی جگہ نہیں۔ اگر بارش ہونے لگی تو اس سے بچاؤ ممکن نہیں۔"

"ہم اور تیز چلنے کی کوشش کریں گے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ جو آپ نے ہمیں ان باتوں سے آگاہ کر دیا۔" میں نے کہا۔ ہم نے گائڈ کو خدا حافظ کہا اور پھر چڑھائی پر تیزی کے ساتھ قدم بڑھانے شروع کئے۔

"کاش کہ میں سوئزرلینڈ میں گائڈ ہوتا!" ہیرن نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"کیوں؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"قدرت کی اندھی طاقتوں کے اس قدر قریب ہونا، طوفان، بارش، برف، تیز ہوائیں، سردی

ان سب کا مزاج سمجھنا اور ان سے دفاع اپنے اوپر لانا، انسانی زندگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟"

"لیکن ان طاقتوں کو قبضہ میں لانے کی یہی تو ایک صورت نہیں کہ آدمی پہاڑیوں میں ساری زندگی بسر کر دے؟"

"ہرگز نہیں، سائنس دان اپنی کوٹھڑیوں میں بیٹھ کر بھی یہ کام کر سکتے ہیں لیکن میری طبیعت اس طرف مائل نہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ طوفانی ہواؤں کے تھپیڑے کھاؤں، اور پہاڑوں کی وادیوں میں دوڑتی ہوئی ہواؤں کی چیخیں سنوں۔ جیسے جیسے درختوں کا بدمست شرابیوں کی طرح جھومنا اور ٹہنیوں کا بے بسی سے تالیاں بجانا، مجھے یہ سب بھی پسند ہیں۔۔۔ لیکن تم تم مجھے ان سب سے زیادہ پسند ہو!"

میں نے ہنس کر کہا: "تو پھر آپ گائڈ کیوں نہیں بن جاتے؟ یہ تو کوئی بڑی مشکل بات نہیں۔"

"شاید اسی وجہ سے کہ یہ مشکل نہیں، میرے گائڈ بننے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ ابھی تک تو انسان خود اپنے روزمرہ کے کاروبار میں اندھی طاقتوں کا شکار بنا ہوا ہے، ابھی تو ہمیں ان انسانی طاقتوں سے لڑائی لڑنا ہے۔ اس کے جیتنے کے بعد پھر ہمیں پوری فرصت ملے گی کہ ہم قدرت کی اندھی طاقتوں سے اپنی اپنی صلاحیت اور پسند کے مطابق دست و گریباں ہوں۔"

میں اسے چھیڑتی جاتی۔ میں نے کہا۔

"آپ تو یوں باتیں کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی ساری مشکلوں اور تکلیفوں کا بار آپ ہی کے کندھوں پر لدا ہوا ہے!"

اس نے تیزی سے جواب دیا۔

"نہیں، مگر میرے کاندھے پر ان مصائب کا ایک حصہ تو ضرور ہے۔ میں تو صرف اسی کو

profakbar.blogspot.com

ہلکا کرنے کی کوشش کرتا چاہتا ہوں۔ اگر ہم سب کو اس کا احساس ہو جائے تو آدھی سے زیادہ لڑائی یونہی ختم ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت اسے بھلا دو۔ اس وقت بس میں تم کو اور صرف تم کو یاد رکھنا چاہتا ہوں!"

"ہم یونہی باتیں کرتے ہوئے پہاڑ پر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے تھے سڑک پتلی ہوتی جاتی تھی۔ کہیں کہیں تو دو آدمی بمشکل ایک ساتھ گزر سکتے تھے۔ چڑھائی سخت تھی، راستہ پر پتھر کے ٹکڑے بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ بعض جگہ بڑی بڑی چٹانیں اوپر سے یوں نکلی ہوئی تھیں کہ راستہ پر آدھی چھت سی بن گئی تھی۔ باوجود کوشش کے ہمارے قدم چڑھائی اور اونچائی کی وجہ سے اب آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔"

"اور میرا دل بھاری تھا، ایک بوجھ سے جو معلوم ہوتا تھا اس طرح عشق سے ملا جلا ہے جیسے ہوا میں بادل ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل تھا۔"

"وہ دن آج کتنا دور معلوم ہوتا ہے۔"

"سب کچھ تھا لیکن میں رہ رہ کر محسوس کرتی تھی کہ میری خوشی پہلے کی سی نہیں تھی۔ میرے دل میں بار بار سوال اٹھتا تھا۔ کیا اس میں کمی ہونا شروع ہو گئی؟ اور میں خود ہی جواب دے لیتی۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ پھر آخر کیا بات تھی؟"

"میں بار بار سوچتی تھی کہ آخر اس بے انتہا محبت کا انجام کیا ہوگا؟ ہیرن مجھے اپنے ساتھ ہندوستان لے جانا چاہتا ہے اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوا تب؟"

"ہیرن غریب ہے اسے روپے کمانے ہوں گے تبھی اس کے ہم کیسے ہندوستان میں ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ اور میں بھی غریب ہوں۔ میں اپنے دل میں کہتی کاش کہ میرے پاس بہت سی دولت ہوتی! پھر خیال آتا تھا کہ مجھے اپنے بے بہا عشق پر اعتماد نہیں۔ مجھے ہیرن پر بھروسہ

نہیں۔ یا خدا میں کس قدر خشکی طبیعت کی ہوں! وہ جس کے لئے میں اپنی جان اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ کیسے میرے دل میں اس کی طرف سے شبہ پیدا ہوا؟"

"مجھے اس لڑکے سے محبت ہے! مجھے اس لڑکے سے بہت محبت ہے۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں جانتی تھی۔ میرا دماغ اس وقت بالکل کام نہیں کرتا۔ نعیم کبھی تم کو پہاڑوں کی عظیم الشان خاموشی کا احساس ہوا ہے؟ اس میں عجیب دلکش ہیبت ہوتی ہے۔ اس وقت وہاں کتنی خاموشی تھی۔ سنا تھا صرف ہمارے چلنے کی آواز، کھٹ پٹ، کچر مر، پتھر کے روڑوں پر سے ہوا بھی بند ہو گئی۔ اور بادل گھرتے چلے آتے ....."

میں نے ہیرن کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہیرن!"

"کیا ہے شیلا؟"

"مجھ سے باتیں کرو۔ میں تمہاری آواز سننا چاہتی ہوں۔"

"اس نے میری طرف محبت بھری ایک نظر دیکھا۔ اور میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہا "جس چیز کے بارے میں تم حکم دو میں تم سے اسی کی باتیں کروں۔"

"جو تمہارا جی چاہے۔ اچھا ہندوستان۔ اپنے ملک کی باتیں کرو۔" میں نے اس سے کہا۔ "ہیرن مجھ سے اکثر ہندوستان کی سوشل اور سیاسی باتوں کے بارے میں گفتگو کر چکا تھا وہ کہنے لگا۔"

"میں تم سے اس ملک کے بارے میں کیا کہوں؟ ہمارے ہاں دنیا کی ہر اچھائی اور دنیا کی ہر برائی انتہا تک پہنچ گئی ہے۔ نہیں میں نے غلط کہا۔ مجھے یہ کہنا چاہیئے کہ ہندوستان میں دنیا کی تمام خوبیاں اپنی حد تک پہنچائی جا سکتی ہیں۔ لیکن برائیاں اپنی حد تک ابھی سے پہنچ گئیں۔"

"تم نے بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ ہندوستان میں "روحانیت" کا بہت زور

blofakbar.blogspot.com

ہے۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ روحانیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو "مادیت" کے برخلاف یعنی مادی چیزوں کی پرواہ نہ کرنا، دین داری، خدا پرستی۔ آخرت کی باتوں کو دنیاوی چیزوں پر ترجیح دینا۔"

"اور دوسرے معنی روحانیت کے کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"دوسرے معنی روحانیت کے یہ ہو سکتے ہیں کہ ایسی دنیاوی زندگی میں لالچ، ہوس، دوسروں پر جبر و ظلم کرنے کی طاقت، جہالت، بدعقلی اور بددیانتی کو ختم کرنا۔ اور زندگی کے سوئے ہوئے نغموں کو جگا کر ان کے سننے کے لئے ہمیں ایک اچھا ماحول، ایک بیدار دماغ اور ایک تندرست جسم چاہئے۔"

"روحانیت کی دونوں قسمیں ہمارے یہاں بالکل مفقود ہیں۔"

میں نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا۔ "آپ تو بڑے مادیت پرست بنتے تھے۔ آج روحانیت کا کیوں آپ پر دورہ ہے؟"

"میں تو مادیت پرست ہوں لیکن وہ اس لئے کہ انسان کی ذہنی اور روحانی ترقی کو ممکن کرنے میں مدد دوں۔ آج جو لوگ روحانیت کا نام لیتے ہیں۔ انکو اس چیز سے کہیں دور کا بھی تعلق نہیں۔ روحانیت ہے کیا؟ مذہب میں خبط یا بوا دماغ!" ہیرن کہنے لگا "تم اخباروں میں پڑھتی ہوگی کہ ہمارے یہاں ہندو، مسلمان اور سکھ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں، مذہبی سوالات کی بنا پر لیکن اسکے کیا یہ معنی ہیں کہ ان میں روحانیت یا مذہبیت بھری ہوئی ہے؟ بالکل نہیں چند مذہبی لیڈر جو بھول کر بھی خدا کو یاد نہیں کرتے۔ گورنمنٹ میں رتبے حاصل کرنے کے لئے جس میں صرف ان کا ذاتی فائدہ ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر بے قصور غریب لوگوں کو مذہب کا نام لے کر آپس میں لڑوا دیتے ہیں۔ مذہب اور روحانیت سے ان کو کوئی واسطہ نہیں۔"

"رہ گئی دوسری قسم کی روحانیت۔ جو قوم غلام ہو۔ جس میں اسی فیصدی انسانوں کو پیٹ بھر کھانا نہ ملتا ہو، جس میں مرض، وبا، بیماری اس قدر پھیلی ہو کہ سارے ملک میں مشکل سے تندرست انسان نظر آتے

ہوں۔ جہاں علم گنتی کے لوگوں تک محدود ہو۔ جہاں بچے تک کملائے ہوئے پھولوں کی طرح ہوں۔ اکثر لوگوں کے چہروں پر بھوک، فاقہ، غربت، مصیبت لکھی ہوئی ہو۔ اور باقیوں کے چہرہ سے سستی، حماقت، جہالت اور ایک مکروہ قسم کی خوشحالی نظر آتی ہو۔ وہاں زندگی کے ان رنگین نغموں کی تلاش کرنا سراسر حماقت ہے۔"

"تم مبالغہ کر رہے ہو۔ یقیناً اس کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں جنہیں ان باتوں کا احساس ہے۔ اور جو تبدیلیاں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

ہیرن ہنسا۔ اس نے کہا "ہاں شاید تمہیں اس لئے یہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے ان میں سے کسی درجے میں نہیں رکھ سکتیں۔ ایک تیسری قسم ہمارے یہاں اور ہے۔ باتیں کرنے والوں کی۔ یہ لوگ سمجھدار ہیں۔ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کی تہہ تک وہ نہ پہنچ سکیں۔ ان میں اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کا مادہ ہے۔ ہر چیز کی اصلیت ہر بات کی وجہ سمجھتے ہیں۔ لیکن بس یہاں تک پہنچ کر وہ آگے بڑھنے سے معذور ہیں۔ ان میں زندگی کو سمجھنے کا مادہ ہے۔ لیکن اس کو تبدیل کرنے کا مادہ نہیں۔ انہوں نے اپنے کو ہندوستان کے کروڑوں محنت کشوں کی حیات بخشنے والی انقلابی جدوجہد سے پیوست نہیں کیا۔ آج ان لوگوں کی حالت سب سے زیادہ افسوسناک ہے۔ بے دلی، آرام پسندی، سستی، ذہنی انتشار کے شکار ہو کر آخر کار یہ لوگ بھی اپاہجوں اور ناکاروں کے گروہ میں مل جاتے ہیں۔"

"تم پر آج ناامیدی غالب معلوم ہوتی ہے جبھی اس طرح سے باتیں کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

یونہی باتیں کرتے کرتے ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ اس جگہ صرف ایک چھوٹا سا چھ سات کمروں کا ہوٹل تھا۔ ایک بلند پہاڑ کے اوپر۔ ہوٹل کے سامنے کی طرف جدھر وہ راستہ تھا جس پر چل کر ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ کوئی آٹھ دس گز لمبا اور تین چار گز چوڑا برآمدہ تھا جو تین طرف سے شیشوں سے بند تھا۔"

profakbar.blogspot.com

"چھ بجنے کے قریب تھے۔ چاروں طرف کالے کالے بادل چھائے جا رہے تھے۔ اور اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن باوجود اس کے یہ مقام اتنا خوبصورت تھا کہ تین گھنٹے کی سخت چڑھائی کی مشقت یہاں پہنچ کر بھول جاتی تھی۔ ایک حوض کی طرح وادی، جس کی تہہ پر سبز مرغزار۔ اسکے بیچوں بیچ میں ایک تیزی سے بہتا ہوا چھوٹا سا دریا۔ چاروں طرف کے پہاڑ اس بلندی سے زیادہ اونچے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ان کی چوٹیوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ ادھر ہی سے زور و شور کے ساتھ بلندی سے گرتے ہوئے آبشار تھے۔ جن کی آواز تمام وادی میں گونج رہی تھی۔ بیچ والا آبشار سب سے بڑا تھا۔ وہ کوئی تیس چالیس گز کی بلندی سے نیچے گرتا تھا۔ اس کے بعد اس کا پانی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا نیچے آکر ایک پرجوش سا دریا بن جاتا تھا اور وہاں سے بہتا ہوا وادیوں میں غائب ہو جاتا تھا۔

ہم اس وقت اکیلے ہوٹل میں تھے۔ ہم ایک میز کے پاس، جہاں سے باہر کا منظر اچھی طرح دکھائی دیتا تھا جا کر بیٹھ گئے۔

"اتنی دور پیدل چلنے کے بعد ہمیں بھوک معلوم ہو رہی تھی۔ ہوٹل کی خادمہ ایک موٹی سی نوجوان دیہاتی سوئس لڑکی۔ ہمارے لئے چائے اور روٹی، مکھن، شہد لے آئی۔ اور ہم نے کھانا پینا شروع کیا۔

"اتنے میں بارش ہونے لگی اور باہر تاریکی بڑھ گئی۔"

"آج ہم یہیں رک جائیں تو بہتر ہے۔" ہیرن نے کہا۔ "اس وقت بارش میں واپس جانا ناممکن ہے۔ لیکن آخر میں تم سے کیوں یہ سب بیان کر رہی ہوں؟ مجھے ہو کیا گیا ہے۔ میری زبان رکتی ہی نہیں۔ نعیم مجھے ایک سگریٹ دو۔"

نعیم نے بڑھ کر اسے سگریٹ دیا۔ اور وہ اسے پینے لگی۔ اس کے چہرے کے ارد گرد نیلے دھوئیں کا نقاب چھا گیا۔ وہ پھر جیسے اپنے خیالات میں ڈوب گئی۔

نعیم نے کہا۔ "شیلا! کیا ہماری مجبوری کا کچھ علاج بھی ہے؟ یہ بھی کتنا تکلیف دہ اتفاق ہے کہ ہم

دونوں جذبات کے اس طوفانی سمندر میں بے بسی کے ساتھ بے بادبان کشتیوں کی طرح تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ بیچاری شیلا!"

لیکن شیلا کرسی پر جیسے سو گئی تھی۔ اسے وہ زائلر والی طوفانی رات یاد آ رہی تھی۔ وہ محبت اور غم کی رات جب سوتے سوتے اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اس نے دھیمی کمزور آواز میں "ہیرن میرے پیارے ہیرن" کہہ کر اسے جگا دیا تھا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"مجھے اپنے سینے سے چمٹا لو۔ دبا کر، مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔" اس نے کہا تھا۔

ہیرن نے اسے زور سے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور اس کے لبوں اور آنکھوں کا بار بار بوسہ لیا۔

"میری پیاری میری سب سے پیاری شیلا!"

پھر اس نے سر ہٹا کر شیلا کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کے بال تکیے پر اور اسکے ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہیرن نے انہیں اٹھایا تھا۔ اور اس کی نرم زلفوں میں اپنی انگلیوں سے آہستہ آہستہ کنگھی کرنے لگا تھا۔ اندھیرے میں اس کے چہرے کا صرف خاکہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں اور بھوؤں کی سیاہی اس کی ناک اس کے لبوں کی ابھری ہوئی لکیر۔

"شیلا! ڈر کس بات کا؟" اس نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ یہاں اتنا سناٹا ہے اور ان آبشاروں کے بہنے کی مسلسل آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ ہیرن! ..... ہمارا ..... ہماری محبت کا انجام کیا ہوگا؟"

"ہماری محبت کا انجام؟" وہ ذرا دیر چپ رہا پھر اس نے کہا۔ "سنو شیلا، میری جان! آج دن کو جب میں تم سے اپنے وطن کی باتیں کر رہا تھا تو میں نے صرف وہاں کی تلخ حقیقتوں کا ذکر کیا تھا۔

profakbar.blogspot.com

تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ وہاں بہت سی اچھی چیزیں بھی ہیں۔ شام کے وقت جب برسات میں سورج ڈوبتا ہے اور آسمان پر آگ لگ جاتی ہے۔ اور جب چاندنی نکلتی ہے اور ہمارے ملک کے ہرے بھرے کھیتوں اور سرسبز میدانوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے دریا پگھلی ہوئی چاندی کی ایک تھراتی ہوئی درخشاں لکیر بن جاتے ہیں اور اس ملک کے کروڑوں محنت کرنے والے انسان جو اپنی غریبی اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنا چاہتے ہیں۔ یہ سب بیش بہا ہیں۔ اس تصویر میں جس کی خوبصورتی میں اتنا سوز و گداز بھرا ہوا ہے میں بھی کسی طرح کھپ جانا چاہتا ہوں۔ اس بات کی خواہش اس کی کوشش یہی میرے لئے حیات ہے۔ یہی زندہ رہنا ہے۔"

"ہمارے لئے زندگی کی اور کوئی دوسری صورت نہیں۔ دوسرے راستے ہمیں روحانی موت کے خشک ریگستان میں لے جاکر چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔"

"دونوں ساتھ زندگی کے اس راستہ پر چلیں گے جو سہل نہیں۔ لیکن پھر بھی ان لطافتوں سے لبریز ہے۔ جو صرف زندگانی کی جدوجہد کا انعام ہیں۔"

"میری جان! ہمارا عشق خود انہی لطافتوں کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ اور اگر ایسا نہ ہوگا تو اس چراغ کی طرح ہوگا جو تیل ختم ہو جانے کے بعد گل ہو جاتا ہے اور جس پر رات کا اندھیرا غالب آ جاتا ہے۔"

"لیکن شیلا ہم اسے گل نہ ہونے دیں گے۔ ہم اپنی باہم کوششوں کے پسینے سے اس چراغ کو جلائے رکھیں گے۔"

"اور اگر زمانے کے بے رحم ہاتھ نے ہمیں ایک دوسرے کے پہلو سے جدا کر دیا؟ اگر نسل و قوم، ملک و ملت کے خداؤں نے ہمیں بے دردی کے ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے سے روکا۔ اور غربت اور فاصلے کی زنجیریں ہمارے پیروں کی بیڑیاں بن گئیں، تب؟ پھر ہم کیا کریں گے؟" لڑکی نے کہا۔

"شیلا مجھے ذرا مہلت دو! میرے پاس تمہارے سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔ سوا کوشش اور امید کے ہر ممکن کے قریب ناممکن کی حیاتک شکل دکھلایا کرتی ہے۔ اگر ہم اس کو اپنے ذہن میں جگہ دیں تو موجودہ اور آنے والی دونوں زندگیاں بدمزہ، ناقابلِ برداشت ہو جائیں گی۔"

"میرن، میرے قیمتی میرن، میری جان" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو کے دو قطرے آہستہ سے اس کے گالوں پر ڈھلک آئے تھے: "مجھے معاف کرو۔ مجھے کچھ نہیں معلوم، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ سوا اس کے کہ میں تم سے بہت بہت، بہت محبت کرتی ہوں۔"

"اور شیلا میں بھی تم سے بہت۔۔۔ بہت بہت محبت کرتا ہوں۔" میرن نے آہستہ سے کہا۔

"انہوں نے ایک دوسرے کو یوں گلے سے لگا لیا کہ اس وقت سارے جہاں کی جدوجہد، دوا دوش، جنگ و پیکار میں صرف ایک آواز ان کے کانوں میں آ رہی تھی، ایک دوسرے کے دل کے دھڑکنے کی آواز۔"

شیلا کا سگریٹ ختم ہو گیا۔ اس نے اسے آتش دان میں پھینک دیا۔ اور وہ کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

"نعیم کو ہندوستان گئے ہوئے ڈیڑھ برس ہو گئے اور میرے پاس چھ مہینے سے اس کے خط بھی نہیں آتے۔ میرے خطوں کا جواب بھی نہیں آتا۔ وہ بنگال کا رہنے والا تھا۔ اور وہاں آزادی پسند نوجوان زیادہ دیر تک آزاد نہیں رہ سکتے۔ میرا دل ڈرتا ہے لیکن وہ گرفتار تو نہیں ہو گیا۔ نہیں! لیکن میرا میرن کبھی مجرم نہیں ہو سکتا۔" شیلا نے زور سے کہا۔

نعیم نے کہا۔ "ہندوستان میں قید ہونے کے لئے مجرم ہونا ضروری نہیں۔ آزادی کی خواہش اس کے لئے کافی ہے۔ لیکن شیلا نا امید مت ہو۔ جب وہ تم سے اتنی محبت کرتا ہے تو ضرور تمہیں خط لکھے گا۔ کوئی

ایسی ہی بات ہوگی۔ جس سے وہ مجبور ہو گیا۔"

شیلا کے لبوں پر ایک غمگین مسکراہٹ آئی۔ "نعیم تمہاری دلجوئی کا شکریہ" وہ کھڑکی کی طرف گئی اور وہاں سے باہر دیکھا۔ آسمان کے ایک کونے سے تاریکی کے پردوں کو پھاڑ کر روشنی جھانک رہی تھی۔

"اوہ صبح ہو گئی۔ معاف کرنا میں اتنی دیر بیٹھی باتیں کیا کی۔ لیکن نعیم میں مجبور تھی۔ تم سمجھتے ہو نا؟ اچھا اب میں جاتی ہوں۔"

اس نے اپنا کوٹ اور ٹوپی جلدی سے پہنا اور نعیم سے ہاتھ ملا کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ نعیم بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

"کیا پھر کبھی ہم ملیں گے؟" نعیم نے پوچھا۔

"معلوم نہیں خدا حافظ نعیم" یہ کہہ کر لڑکی آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

نعیم چپ چاپ اپنی آرام کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور بڑی دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔ آگ بالکل بجھ گئی۔ کمرے میں ٹھنڈک بڑھ گئی۔ صبح کی پھیکی روشنی، چور کی طرح کھڑکی کے راستے دبے قدم اندر آنے لگی۔

profakbar.blogspot.com